ماحول اور ادب: آزاد کشمیر کی اردو شاعری کا ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں جائزہ

مقالہ برائے ایم فل (اردو)

مقالہ نگار:

خاور نذیر

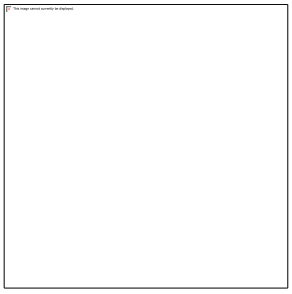

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۳ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور ڈین فکیلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ماحول اور ادب: آزاد کشمیر کی اردو شاعری کا ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں جائزہ

پیش کار: خاور نذیر رجسٹریشن نمبر: NUML-F20-21723

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر محمود الحسن: ----------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: ----------

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

تاریخ----------

اقرار نامہ

میں خاور نذیر اس بات کا حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا اپنا ہے جو میں نے نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز سے ایم۔فل کی سند کے حصول کے لیے ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔ یہ کام میں نے اس سے پہلے کسی بھی سندی یا غیر سندی تحقیق کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کبھی سندی تحقیق کے لیے پیش کروں گا۔

مقالہ نگار

خاور نذیر

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز

جون 2023ء

فہرست

عنوان		صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم		II
اقرار نامہ		III
ABSTRACT		VII
اظہار تشکر		VIII
باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث		01
الف۔ موضوع کا تعارف		
I	تمہید	01
II	بیان مسئلہ	01
III	مقاصد تحقیق	02
IV	سوالات تحقیق	02
V	نظری دائرہ کار	02
VI	تحقیقی طریقہ کار	04
VII	موضوع پر ما قبل تحقیقی کام	04
VIII	تحدید	05
IX	پس منظری مطالعہ	05

X تحقیق کی اہمیت 06

ب۔بنیادی مباحث 06

I ماحول 06

II ماحولیات 14

III ماحولیاتی تنقید اور اس کے عناصر 17

IV اردو ادب اور ماحولیات۔ 30

باب دوم : آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں بن نگاری اور حیات مرکزیت 40

I بن نگاری 40

II نظم میں بن نگاری 41

III غزل میں بن نگاری 73

IV حیات مرکزیت 81

V نظم میں حیات مرکزیت 83

VI غزل میں حیات مرکزیت 95

باب سوم: آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مقاماتی ماحولیات اور راعیانیت 109

I مقاماتی ادب 109

II نظم میں مقاماتی ادب 111

III غزل میں مقاماتی ادب 131

IV راعیانیت 139

V نظم میں راعیانیت 141

VI غزل میں راعیانیت 153

ماحصل **174**

I تحقیقی نتائج 188

II سفارشات 190

III کتابیات 192

ABSTRACT

TITLE: ECO AND LITERATUR: AN ECO-CRITICAL ANALYSIS OF AZAD KASHMIR'S URDU POETRY

Eco-criticism is a modern age critical perspective which deals with the study of relation between nature and literature. As this age is facing serious environmental crises and these crises are the result of man's undue interference in the green world, which includes the destruction of nature, establishment of industries, construction of buildings and roads in wild areas, development of cities and towns etc.

Eco-criticism strongly condemns the anthropocentric way of interference. It reconsiders the relation of human with non-human nature by considering this Earth and Bio as center which promotes biocentrism. The alarming situation of environmental crises demands a serious concern at every level. Word literature and criticism is focusing this issue at satisfactory level. Many books are appearing on the scene in a short period including Science, Science fiction, fiction, non-fiction, poetry and criticism. Urdu literature has deep concern and realization of this changing environmental situation and local environmental problems. But Eco-critical study of these kinds of writings is not meeting the need. This research is a step towards the need of hour. It is an ECO-CRITICAL ANALYSIS OF AZAD KASHMIR'S URDU POETRY. Azad Kashmir has a rich history of literature in the continuation of the legacy Azad Kashmir is producing more and more literary people. The poets of kashmir are introducing a unique style of Nature Writings which fulfils the environmental needs as well as meet the needs of a master piece of Poetics. In this Research the researcher will analyze Azad Kashmir's Urdu poetry through four eco-critical perspectives WILDERNESS, BIOCENTRISM, LITERATURE OF PLACE AND PASTORALISM. This critical analysis will be considered a fruitful contribution of researcher in Urdu Ecocriticism.

اظہار تشکر

مقام شکر ہے کہ خدا تعالی نے مجھے میرے مقصد تک پہنچنے میں کبھی نا امید نہیں ہونے دیا۔ جب کبھی محسوس ہوا کہ بوجھ بہت زیادہ بڑھ گیا تو آواز آئی "لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا" جب کبھی مایوس ہوا تو "لا تقنطوا من الرحمۃ اللہ " کی صدا سنائی دی۔ یہ کام جس قدر میرے لیے دشوار تھا اسی قدر اس کو نبھانا مشکل تھا ایسا اس لیے تھا کہ گزرے برس چند ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی جس کے باعث مجھے تعلیمی سرگرمیوں سے دور ہونا پڑ گیا۔ تاہم خدائے بزرگ وبرتر نے ہمت بندھائی اور میں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

مقالے کے موضوع کے انتخاب میں میری رہنمائی جناب عابد سیال نے کی جن کا میں تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ کی مشفقانہ رہنمائی کے بغیر یہ سب ممکن نہیں تھا۔ اس مقالے کو مکمل کرنے میں میری سب سے زیادہ رہنمائی جناب ڈاکٹر محمود الحسن نے کی جس کے باعث آج یہ مقالہ مکمل شکل میں آپ حضرات کے سامنے ہے۔ محترمہ ڈاکٹر فوزیہ اسلم (صدر شعبہ اردو نمل)، ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ اور ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر یوسف میر صدر شعبہ اردو آزاد جموں وکشمیر یونیورسٹی اور فرہاد احمد فگار (لیکچرر اردو پی ایچ ڈی سکالر نمل) کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جن کی کتب اور رہنمائی کی بدولت یہ کام مکمل ہو سکا۔ ان تمام شعرا کا شکریہ جنھوں نے میرے کہنے پر مجھے اپنی مطبوعہ وغیر مطبوعہ شاعری بہم پہنچائی۔

میرے والدین بہن بھائیوں کا بے حد شکریہ جنھوں نے اس مشکل وقت میں میری مدد کی۔ مجھے معاش کی فکر سے مکمل آزاد اور دور رکھا۔ سب سے آخر پر میں شکر گزار ہوں اپنی رفیقہ حیات کا کہ جن کی رفاقت اور محبت کے سبب میں یہ کام مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔ جنھوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر میری ہمرہی کی۔ مجھے کبھی میرے فرض سے غافل نہیں ہونے دیا جب کبھی تھکن بڑھ گئی تو اسے اتارنے میں میری مددگار ہوئیں۔

باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

I موضوع کا تعارف(Introduction)

میرے ایم فل اردو کے مقالے کا مجوزہ موضوع "ماحول اور ادب: آزاد کشمیر کی اردو شاعری کا ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں جائزہ" ہے۔ یہ موضوع آزاد کشمیر میں اردو شاعری کے ماحولیاتی مطالعے سے متعلق ہے۔کسی بھی خطے میں تخلیق ہونے والا ادب اس کے ماحول سے براہِ راست متاثر ہوتا ہے۔ایسا خطہ جہاں ماحول میں نت نئی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہوں وہاں ہر آنے والا دن نت نئے موضوعات اور مباحث کو جنم دیتا ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد کشمیر کے کچھ حصے کو ڈوگرہ راج سے آزادی نصیب ہوئی جس کو آزاد کشمیر کہا جاتا ہے۔زیادہ تر علاقہ ہندوستان کے قبضے میں ہے جس کو مقبوضہ کشمیر کا نام دیا گیا ہے۔کشمیر کو دنیا میں جنت نظیر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔شعری لحاظ سے بھی یہ زمین کافی زرخیز ہے۔آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد یہاں کئی شعرا نے جنم لیا ان میں سے کئی شعرا کو عالمی شہرت نصیب ہوئی اور اپنے عہد کے اردو ادب کے مشاہیر کے ساتھ مراسم اور روابط میں رہے ہیں۔کشمیر جنت نظیر ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے جس کی وجہ سے یہ خطہ دنیا بھر کے جمال پرست ادیبوں کی نگاہوں کا مرکز رہا ہے۔ تاہم نام نہاد صنعتی ترقی کے نام پر یہاں کی فطرت کو مسخ بھی کیا گیا ہے۔یہ عمل یہاں کے تمام جانداروں کا نوحہ بنا ہوا ہے۔ سماج کا پڑھا لکھا ذی شعور طبقہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

شاعر کا شمار سماج کے پڑھے لکھے، ذی شعور اور حساس طبقے میں ہوتا ہے۔ ماحولیاتی تبدیلیاں اس پر پوری طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں۔بدلتے ہوئے حالات کو شاعر زیرک نظری سے دیکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب کسی بھی معاشرے میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو شاعر اس کی حمایت یا مخالفت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔معاشرے میں رو نما ہونے والی ہر تبدیلی ادب کو نت نئے موضوعات عطا کرتی ہے۔

II بیان مسئلہ (Problem Statement)

ریاست آزاد جموں کشمیر اپنی خوب صورتی کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے۔ آزاد کشمیر میں اردو شاعری کو بھی کافی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ شاعر اپنے سماج سے کٹ کر رہنے کی بجائے اس کے اثرات کو قبول کرتا ہے۔ تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے ماحولیاتی حالات کے باعث آزاد کشمیر کی شاعری میں کافی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔میرے اس تحقیقی کام کا مقصد آزاد کشمیر میں تخلیق ہونے والی اردو شاعری کا ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں جائزہ لے کر آزاد کشمیر میں تخلیق ہونے والی شاعری میں موجود فطرتی مناظر سمیت فطرت پر ڈھائے جانے والے مظالم کو منظر عام پر لانا ہے۔

III مقاصدِ تحقیق (Research Objectives)

ا۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں موجود بن نگاری اور حیات مرکزیت کے عناصر کو سامنے لانا۔

۲۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری سے مقاماتی ماحولیات اور راعیانیت کے عناصر کو واضح کرنا۔

IV سوالات تحقیق (Research Questions)

ا۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں بن نگاری اور حیات مرکزیت کے عناصر کو کس طرح برتا گیا ہے؟

۲۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مقاماتی ماحولیات اور راعیانیت کی نوعیت کیا ہے؟

V نظری دائرہ کار (Theoretical Framework)

مجوزہ تحقیقی موضوع "ماحول اور ادب: آزاد کشمیر کی اردو شاعری کا ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں جائزہ" ہے جو ماحولیاتی تنقید کی ذیل میں آزاد کشمیر میں کی جانے والی شاعری کا تجزیہ ہو گا۔ ماحولیاتی تنقید ادب اور ادبی ماحول کے باہمی تعلق کا نام ہے۔ جس پر ہر دور کے ادب کا انحصار رہا ہے۔اس تنقید کی رو سے ادب

ماحول کو محفوظ بنانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ڈاکٹر اورنگزیب نیازی ماحولیاتی تنقید کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ماحولیاتی تنقید ادب اور طبعی ماحول کے مابین رشتوں کے مطالعے کا نام ہے۔ماحولیاتی تنقید ادب اور فطرت کے تعلق اور ماحولیاتی بحران کے اسباب پر سوال قائم کرتی ہے۔۔۔ ماحولیاتی تنقید کوئی تھیوری نہیں بل کہ ساختیات، مارکسیت، تحلیل نفسی اور تانیثیت کی طرح ایک طرز مطالعہ کا نام ہے جو ادبی تخلیقات کے مطالعات کے لیے ایک زمین مرکز منہاج اختیار کرتی ہے۔

ماحولیاتی تنقید الگ سے کسی تنقیدی نظریے کا نام نہیں بل کہ یہ تحلیل نفسی اور ساختیات کی طرح ہی ایک طرز مطالعہ کا نام ہے۔اس کا محور و مرکز باقی تنقیدی نظریات کی طرح انسان نہیں بل کہ ان کے برعکس زمین اور ماحول ہے۔اس تنقیدی نظریے کی تفہیم کے لیے انگریزی نقاد Tamothi Clarckاور Greg Garrerd کے تنقیدی نظریات سے استفادہ کیا گیاہے۔اس نظریے کے درج ذیل عناصر کو بنیاد بنا کر آزاد کشمیر کی اردو شاعری کا مطالعہ کیا جائے گا۔

بن نگاری: (Wilderness writings)

بن نگاری سے مراد ادب میں زمین کے ان حصوں کی بات کرنا جو انسانی تسلط سے آزاد ہیں۔ جہاں انسان نے ترقی کے نام پر فطرت میں اکھاڑ پچھاڑ نہیں کی اور نہ ہی دوسری مخلوقات پر افضلیت کے ناتے حق جتانے کی کوشش کی ہے۔ بن نگاری صرف جنگلات سے متعلق ہی نہیں بل کہ زمین کے ہر اس حصے کے بارے میں ہے جو انسانی پہنچ سے دور فطری زندگی کی عکاس ہے۔

حیات مرکزیت:(Biocentrism)

انسان کی یہ خام خیالی کہ یہ زمین و آسمان کے لیے ہیں اور یہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ حیات مرکزیت اس نظریے کے برعکس ہر مخلوق کو برابر سمجھنے کا نام ہے۔ادبی انداز میں گفت گو کے اس طریقہ کار کو حیات مرکزیت کا

نام دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ادب میں انسان کے ہاتھوں فطرت کے استحصال کا بیان بھی اسی زمرے میں آئے گا۔

مقاماتی ادب: (Literature of place)

مقاماتی ادب سے مراد ایسا ادب ہے جو کسی جگہ کہ بارے میں لکھا گیا ہو۔ مقاماتی ادب میں ماحولیاتی عوامل کا ہونا لازم ہے۔ اس ادب کسی پہاڑی سلسلے، ندی، دریا، جھیل، سمندر یا کسی بھی جگہ کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ اس ادب میں ماحولیاتی پیش کش کا ہونا ضروری ہے۔

راعیانیت:(Pastoralism)

راعیانت سے مراد چرواہے کی زندگی ہے۔ اصطلاح میں دیہی زندگی کی پیش کش جس میں تصنع اور بناوٹ شامل نہ ہو راعیانیت ہے۔ اس میں دیہات کی سادہ طرزِ بود و باش کو شہر کی مشینی زندگی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ دیہی زندگی کی پیش کش کے ساتھ ساتھ کم ہوتی ہوئی فطرتی عمل داری اور شہروں کی بڑھوتری بھی راعیانیت کا موضوع ہے۔

VI تحقیقی طریق کار(Research Methodology)

مجوزہ موضوع پر تحقیقی کام کرتے ہوئے محقق تحقیق کے معیاری اور مروجہ طریقوں کو بروئے کار لائے گا۔ دورانِ تحقیق میں تجزیاتی طریقہ تحقیق کو اپنایا جائے گا۔ اس سے پہلے مجوزہ موضوع سے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ دورانِ تحقیق میں مختلف جامعات کی لائبریریز سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ جن میں نمل (NUML) کی "نذیر لائبریری"، "ادارہ فروغ قومی زبان" اور جامعہ آزاد جموں و کشمیر کی "سینٹرل لائبریری" شامل ہیں۔

اس کے علاوہ آن لائن ڈیجیٹل لائبریری سے بھرپور استفادہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مختلف رسائل اور جرائد سمیت آن لائن ویب سائٹس جیسے "ریختہ" اور "ای لائبریری" سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ مجوزہ موضوع سے متعلق جن ذرائع سے بھی معلومات یا مواد حاصل ہو گا ان سے استفادہ کیا جائے گا۔

VII مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق (Works Already Done)

آزاد کشمیر کی شاعری کے حوالے سے اس سے پہلے بھی بیش تر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ شعرا کے سوانح اور کلام کے حوالے سے انفرادی طور پر بھی کام ہوا ہے۔ تاہم میرا مجوزہ موضوع اس کام سے منفرد ہے ذیل میں آزاد کشمیر کی شاعری پر ہونے والے تحقیقی کام کی فہرست شامل کی جاتی ہے:

افتخار مغل، آزاد کشمیر میں اردو شاعری، ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۱۹۹۷

فرہاد احمد فگار، آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا، ایم فل، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، ۲۰۱۸

میر یوسف میر، آزاد کشمیر میں حمد و نعت کی روایت، پی ایچ ڈی، ہزارہ یونی ورسٹی، ۲۰۲۱

VIII تحدید (Delimitation)

آزاد کشمیر شعری اثاثے سے بھرپور ریاست ہے جہاں پر کئی نام ور اور عہد ساز شعرا پیدا ہوئے ہیں اس لیے پورے آزاد کشمیر کے شعرا کو احاطۂ تحقیق میں لانا ممکن نہیں ہو گا اس لیے اس تحقیق میں آزاد کشمیر کے چنیدہ شعرا کو ہی جگہ دی جائے گی۔اس تحقیق میں آزاد کشمیر کے اکیسویں صدی میں موجود شعرا کو جگہ دی گئی ہے۔صاحبِ کتاب شعرا میں ڈاکٹر صابر آفاقی، زاہد کلیم، مخلص وجدانی، ناز مظفر آبادی، ایم یامین، منور احمد قریشی، ڈاکٹر افتخار مغل، احمد عطااللہ،سید شہباز گردیزی، اعجاز نعمانی، شفیق راجا، جاوید الحسن جاوید،کاشف رفیق، واحد اعجاز میر، اور قاسم سیلانی شامل ہیں۔جب کہ غیر مطبوعہ کلام کے حامل شعرا میں اسرار مغل، احمد آفاق، اسلم رضا خواجہ، اور رضا علی عابدی کو شاملِ تحقیق رکھا گیا ہے۔

درج بالا تمام شعرا کو اس لیے تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے کہ ان کے کلام میں جا بجا ماحولیاتی عناصر کو برتا گیا ہے اور یہ شعرا اکیسویں صدی میں آزاد کشمیر کے شعری منظر نامے پر موجود رہے ہیں۔

IX پس منظری مطالعہ (Literature Review)

اس موضوع پر کام کرنے کے لیے جن شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا گیا ہے ان میں ڈاکٹر صابر آفاقی، زاہد کلیم، مخلص وجدانی، ناز مظفر آبادی، ایم یامین، ڈاکٹر افتخار مغل، احم عطا اللہ،سید شہباز گردیزی، اعجاز نعمانی، شفیق راجا، جاوید الحسن جاوید،کاشف رفیق بھٹی، واحد اعجاز میر، اور شوزیب کاشر شامل ہیں۔اس موضوع کے پیش نظر افتخار مغل کے تحقیقی مقالے "آزاد کشمیر میں اردو شاعری" فرہاد احمد فگار کے تحقیقی مقالے " آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا" کا بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔مختلف شعرا پر ہونے والے انفرادی تحقیقی کام پر بھی نظر دوڑائی گئی ہے۔

تنقیدی طرز عمل کو سمجھنے کے لیے مختلف کتب کا سہارا لیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر شازلی حسن کی کتاب ماحولیاتی سائنس(ماحولیات کے بنیادی تصورات)، ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کی کتاب ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل، Charyll Glotfeltyاور Harold Fromm کی مرتبہ کتاب the Eco criticism reader: land mark in literature ecology سے استفادہ کیا گیا ہے۔

X تحقیق کی اہمیت(Significance of Study)

" ماحول اور ادب: آزاد کشمیر کی اردو شاعری کا ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں جائزہ "اپنی نوعیت کا ایک الگ اور منفرد موضوع ہے۔ میری تحقیق کے مطابق اس سے پہلے اس موضوع پر کسی قسم کا کوئی کام نہیں ہوا جس کی وجہ سے اس موضوع میں مجھے اپنی طرف مائل کیا اور مجبور ہوا کہ اس موضوع پر کام کیا جائے۔ تحقیق کے بحرِ وسیع میں ابھی تک یہ کام تشنہ طلب ہے جس پر تحقیق ہونا ابھی باقی ہے۔

اس سے قبل آزاد کشمیر کی شاعری پر کچھ نہ کچھ کام ضرور ہوا ہے مگر اس طرز کا کام اس سے پیش تر نہیں ہوا۔ آزاد کشمیر کی شاعری کے موضوع پر اس سے پہلے افتخار مغل نے "آزاد کشمیر میں اردو شاعری" کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ایم فل کی سطح کا مقالہ تحریر کیا۔ بعد ازاں فرہاد احمد فگار نے آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا کے موضوع پر نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز سے ایم فل کی سطح کا مقالہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ میر یوسف میر نے بھی آزاد کشمیر میں حمد و نعت کی روایت پر ہزارہ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سطح کا مقالہ تحریر کر

رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایم اے اور ایم فل کی سطح پر انفرادی طور پر شعرا کے کلام اور حالات زندگی کے حوالے سے مقالات تحریر ہوئے ہیں۔

یہ تمام تر موضوعات میرے موضوع سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتے۔ اس لیے تحقیق کی رو سے میرا مجوزہ کام اپنے تحقیقی موضوع کے لحاظ سے مختلف ہے اور منفرد ہے۔ جس میں آزاد کشمیر میں تخلیق ہونے والی شاعری کا ماحولیاتی تنقید تناظر میں جائزہ لیا جائے گا۔

ب۔ بنیادی مباحث

I ماحول:

ماحول عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی گھر اور اردگرد کے ہیں۔ ہمارے گردوپیش میں موجود ہر چیز ماحول کہلاتی ہے۔ ہماری زمین کے جس خطے میں ہم رہتے ہیں اس کا ایک ماحول ہے۔ ماحول کئی چیزوں کے ملاپ سے وجود میں آتا ہے۔ ایک ماحول وہ ہے۔ جس کو معاشرے کی روح قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک ماحول وہ ہے جس کو معاشرے کی بیرونی یا جسمانی حالت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ معاشرے کی روحانی کیفیت فرد کی حالت زار اور اس کی زندگی میں اس کے داخلی کیفیات ظاہر ہوتی ہیں۔ ماحول فرد کی زندگی میں اثر انداز ہوتا ہے یہ عمرانیات کا نہایت وسیع اور تشریح طلب موضوع ہے لہٰذا یہاں پر ہمارا مقصد ہمارے گردوپیش میں موجود ان تمام چیزوں سے متعلق بحث کرنا ہے جو ہمارے بیرونی معاشرے یا ماحول سے متعلق ہیں۔ وہ تمام چیزیں جو انسانوں سمیت پورے خطہ ارض کی ہر چیز ایک کو ظاہری طور پر متاثر کرتی ہیں، ماحول کا حصہ ہیں۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> انسان جغرافیائی عوامل اور اخلاقی و معاشرتی آداب و اطوار، عقائد، ضوابط اور روابط میں گھرا ہوا ہے۔ انھیں من حیث المجموع ماحول کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شعور اور ماحول میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ اسے بیان کرنے کے لیے یہاں تک کہ دیا جاتا ہے کہ شعور درحقیقت ماحول ہی کی پیداوار ہے۔ چناں چہ کارل مارکس نے بھی شعور اور ماحول کے گہرے تعلق کو بیان کرنے کے لیے یہی پیرایہ اختیار کیا ہے۔[1]

کسی بھی انسان کے شعوری ارتقا میں اس کے ماحول کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ انسان مدنی الطبع ہونے کے باعث اپنے ماحول میں انسانوں کو کثیر تعداد میں پاتا ہے۔ انسانوں کی اس قدر کثرت سے اس کو نئے نظریات اور خیالات آتے ہیں جو ایک انسان دوسرے انسانوں سے بہت کچھ اخذ کرتا ہے۔ انسان ایک معاشرے میں رہتے ہوئے جہاں بہت سی چیزیں اپنے ہم جنسوں سے اخذ کرتا ہے تو وہیں پر بہت سی چیزیں وہ اپنے ہم جنسوں کو عطا کرتا ہے۔ گویا ایک انسان ایک معاشرے میں شعور کے اخذ و عطا کے سلسلے کو جاری رکھتا ہے۔ ایک انسان جہاں پر ماحول سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے وہیں پر وہ اپنے ماحول کے بعض رویوں پر نالاں بھی نظر آتا ہے۔ اس کی یہ نارضی بھی اس کے شعور کی تابع ہوتی ہے کیوں کہ وہ اپنے معاشرے میں موجود ہر چیز سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی سوچ بھی ہر آنے والے دن کے ساتھ نئے نظریات و خیالات کے ساتھ کروٹیں بدلتی ہوئی سامنے آتی ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> حساس اور فہیم لوگوں کا شعور ماحول کی بعض صورتوں کے خلاف جہاد کرتا ہے گویا شعور کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو ماحول کی اطاعت قبول نہیں کرتا چناں چہ جہاں یہ بات درست ہے انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے وہاں یہ بھی درست ہے کہ انسان اپنے ماحول کا خالق بھی ہے۔[۲]

کسی بھی ماحول کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی آسان لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ماحول کے دو اجزا ہوتے ہیں۔ ماحول کا پہلا جزو تو جغرافیائی تشکیل ہے۔ یعنی وہ علاقہ جو کسی بھی چیز کے گرد ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آب و ہوا اور موسم وغیرہ۔ اس علاقے کی زمینی ساخت اور بیرونی عوامل زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسے عوامل میں اس علاقے میں موجود ہر ایک چیز پہاڑ، دریا، جھرنے، میدان، ندیاں، چشمے، موسمی تغیرات الغرض ہر طرح کی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ماحول کا دوسرا جزو سماج ہے۔

سماج میں انسانی اور غیر انسانی ہر طرح کے عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ سماج ایک ایسا علاقہ ہے جسے خاص طور پر انسانوں کے رہنے کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس علاقے میں انسان ایک دوسرے

کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے رہتے ہیں۔ سماجی عوامل میں انسان کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے کیوں کہ سماج کے لیے ایک سے زیادہ انسانوں کے گروہ کا موجود ہونا لازم ہوتا ہے۔ سماجی عوامل میں جغرافیائی تشکیل بھی کافی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ یہ تشکیل ہی انسانوں کو سماج بنانے پر مجبور کرتی ہے بقول ابو الاعجاز حفیظ صدیقی:

> ماحول کی تشکیل جغرافیائی عوامل اور سماجی عوامل سے ہوتی ہے جغرافیائی عوامل انسان کو جو گردوپیش میں مہیا کرتے ہیں جغرافیائی ماحول اور سماجی عوامل انسان کو جو معاشرتی فضا مہیا کرتے ہیں اسے سماجی ماحول کہا جاتا ہے۔[۳]

جغرافیائی ماحول کسی بھی جاندار کی سرگرمی اور موروثی خصوصیات کو بھرپور انداز میں متاثر کرتا ہے۔ جغرافیائی ماحول ہی انسانی سماج کے ساتھ ساتھ وہاں پنپنے والی تہذیب و ثقافت کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مختلف جغرافیائی عوامل سماج کی تشکیل میں اختلاف کا باعث بنتے ہیں۔ اس بات کو ہم چند مثالوں سے سمجھ سمجھتے ہیں۔ وہ علاقے جو سرد ہیں، ان علاقوں کے لوگوں کا رہن سہن بھی اپنے جغرافیائی حالات کے مطابق ہوگا۔ ان کا لباس بھی ویسا ہی ہوگا۔ مذہبی اور ثقافتی تہوار بھی موسم کو دیکھ کر ہی منعقد کیے جائیں گے۔ جب ان تمام چیزوں کو بحیثیت مجموعی دیکھا جاتا ہے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ جغرافیائی یا بیرونی عناصر سماجی ماحول پر پوری طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے اپنے جغرافیائی حالات ہوتے ہیں جو اس علاقے کی تہذیب و تمدن کو بناتے ہیں۔ یہی تمدن جب احساسات اور خیالات کے ساتھ قلم بند ہوتا ہے تو ادب کی تشکیل ہو جاتی ہے۔ یوں ہم کہ سکتے ہیں کہ ادب بھی اپنے جغرافیائی عوامل کی براہ راست دین ہے۔ جوں جوں جغرافیائی عوامل میں تبدیلی رونما ہوتی جائے گی توں توں تہذیب و ثقافت، تمدن اور ادب میں بھی تبدیلی آنا شروع ہو جائے گی۔ تمام عوامل ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک اچھا جغرافیائی ماحول ایک صحت مند سماج ترتیب دیتا ہے۔ ایک صحت مند سماج صحت مند ادب کا خالق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وائے کے سنگھ لکھتے ہیں:

Literary environment means the surrounding external conditions influencing development or growth of people, animal or plants; living or working conditions etc. This involves three questions:

۱. What is Surrounded? The answer to this question is living objects in general and man in particular.

۲. By what Surrounded? The physical attributes are the answer to this question, which become environment. Infact, the concern of all education is the environment of man. However, man cannot exist or be understood in isolation from the other forms of life and from plant life. Hence, environment refers to the sum total of condition, which surround point in space and time. The scope of the term Environment has been changing and widening by the passage of time. In the primitive age, the environment consisted of only physical aspects of the planted earth' land, air and water as biological communities. As the time passed on man extended his environment through his social, economic and political functions. [۴]

انسان جس جگہ پر رہتا ہے وہاں کی ہر چیز سے مانوس ہوتا ہے۔ ہر چیز اسے پوری طرح سے متاثر کرتی ہے۔ ادب دراصل زندگی کا آئینہ ہے جب کسی سماج میں آئینہ پوری آب و تاب سے موجود ہوتا ہے وہاں پر سارے لوگ اس آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی درستی کرلیتے ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات اور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ماحول میں موجود ہر چیز انسان اور دیگر جانداروں کو متاثر کرتی ہے۔ موسمی تغیرات، علاقائی ساختیات اور جغرافیہ غرض ہر ایک چیز سے انسان متاثر ہوتا ہے۔

وہ چیزیں جو ایک عام انسان کو متاثر کرتی ہیں وہی چیزیں ادیب کو عام انسان سے زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ ادیب جب ان چیزوں کو ادب پارے میں بیان کرتا ہے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ادب پر ماحول اور ماحولیاتی عناصر کا اثر بڑی شدت سے موجود ہوتا ہے۔ ماحول کے اثرات سے ادب کو نہی نہیں سمجھا جا سکتا کیوں کہ ادب ماحول ماحولیاتی عناصر کے تابع ہوتا ہے۔

ایک شخص جو صحرا کا مکین ہے۔ اس کی طبیعت کو وہی رنگ اور انداز راس آتا ہے وہ اپنی گفت گو میں اس علاقے کی مخصوص سے اصطلاحات کا استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح صحرا کے رہنے والا ادیب اپنی شاعری میں وہی صحرائی رنگ لے کر آئے گا اس کی زندگی میں آنے والی مشکلات اور صحرائی زندگی کی خوب صورتی کا تذکرہ ہو گا۔ ایک ادیب جو صحرا میں موجود ہے اس کی تخلیق میں ہر صورت اس صحرا کا نقشہ ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کوئی ادیب چاہتے نہ چاہتے ہوئے یہ عمل نہیں کرتا بل کہ یہ عمل اس کی فطرت میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔اس نے جس علاقے کا نظارہ اپنے بچپن میں کیا اس مخصوص علاقے کے ساتھ اس کے جذبات اور احساسات جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

کسی علاقے کے جغرافیائی اور موسمی حالات ایک انسان کو اس کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک ایسا انسان جو کسی پہاڑی علاقے کا مکین ہے وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ وہاں سنائی جانے والی لوک کہانی اور داستان میں اسی علاقے کے پہاڑوں اور چٹانوں کا ذکر ہوتا ہے۔ گویا ایک مخصوص ادب ہر صورت میں اپنے اندر اپنے ماحول اور ماحولیاتی عناصر کا ذکر چھیڑے گا۔ اس علاقے کے ہر ادیب کی تخلیقات میں وہاں کے رنگ نمایاں ہوتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ جیسے کشمیر میں بسنے اور کشمیر سے تعلق رکھنے والے شعرا چنار جب کہ دہلی اور لکھنو کے شعرا سرو کو اپنی شاعری میں اہمیت دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کشمیری شعرا کی شاعری میں وہاں پر بہنے والے دریاؤں کے نام موجود ہیں جب کہ دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے شعرا وہاں پر موجود دریاؤں کے ناموں کو اپنی تخلیقات میں جگہ دیتے ہیں۔ ہر علاقے کے موسمی تغیرات بھی ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جن علاقوں کا موسم ٹھنڈا ہو ان

علاقوں کے ادبا کی تخلیقات میں اسی طرح کے مناظر تخلیق کیے جاتے ہیں جن میں سردی کا عنصر نمایاں ہو گا۔ ان علاقوں میں لوگوں کی تہذیب و ثقافت پر بھی خوب اثر پڑتا ہے اور تمدن بھی متاثر ہوتا ہے۔ یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے کیوں کہ انسان اپنی ضرورت مطابق انسانی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھاتا ہے۔ ادب تہذیب و ثقافت کا پروردہ ہونے کے ساتھ ساتھ لازمی جزو بھی ہے۔

دنیا کا ہر ادب تہذیب و ثقافت کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ جس قدر تہذیب و ثقافت ترقی یافتہ ہو اسی قدر ادب بھی ترقی یافتہ ہوتاہے۔ ادب کو ماحول کے اثرات سے عاری کہنا بے جا اور فضول ہے۔ دریا کے قریب رہنے والے ادیب اس دریا سے کوئی نیا موضوع تراش لیتے ہیں۔ صحرا کے قریب رہنے والے ادیب صحرا سے نت نئے ادب کے معنی و مفاہیم چرا لیتا ہے۔ سرسبز بستی کا مکین اپنے گرد وپیش میں پھیلی ہوئی سبزی سے ادب کشید کرتا ہے۔ میدانی علاقے کا ادیب میدان اور پہاڑی علاقے کا ادیب پہاڑسے ادب پروری کا کام لیتا ہے۔

المختصر کسی علاقے کا ماحول اس علاقے کی زبان، محاورے، ضرب الامثال، کہاوتوں، لوک داستانوں، عام گفت گو، رہن سہن کے طریقوں، لباس اور پہناوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب یہ اثر اندازی معاشرے میں وقوع پذیر ہوتی ہے تو وہاں پر تخلیق ہونے والا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادب کو سماج کا آئینہ کہنا غلط نہیں سماج پر ماحول کے اثرات اندازی کو بہرصورت ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر علاقے کے ادب میں وہاں کے ماحول کے اثرات پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہاادب ماحول سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ ادب اور ماحول کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔جب تک ادب موجود رہے گا وہ کسی نہ کسی صورت میں ماحول سے متاثر ہی رہے گا۔ ماحول کو عام طور پر انسان اور انسانی سماج کے ساتھ نتھی کرکے پیش کیا جاتا ہے ۔تاہم انسانی سماج ماحول کا صرف ایک جزو ہے۔ اس میں انسان اور اس کی تخلیق ہوئی مصنوعی دنیا شامل ہوتی ہے۔ادب ان تمام چیزوں سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ ادب ایک ادیب سے تخلیق ہوتا ہے اس کی تخلیق جن چیزوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہو تمام چیزیں اس پر بھی نمایاں چھاپ چھوڑ کر جاتی ہیں۔

کسی کی بھی ادب پر ماحولیاتی عناصر کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے مختلف خطوں میں تخلیق ہونے والے ادب اور اس کے ادبی رجحانات کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ جب ہم یورپی ادب کی بات کرتے ہیں تو اس ادب میں علاقائیت اور ماحولیاتی عناصر کو وہاں کے طور طریقوں کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ سرد موسم کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ یورپ کی پہاڑیوں، برف باری اور وادیوں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس ادب میں سمندروں، ساحلوں، دریاؤں اور ندی نالوں کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔اسی طرح جب عربی ادب پر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی صحراؤں کا ذکر شامل ہوتا ہے۔ گرم مرطوب آب و ہوا، بے آب و گیاہ صحراؤں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مشہور لوک داستانوں میں بھی صحرائی ٹیلوں اور کھجور کے درختوں کا ذکر ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ عرب کے لوگ جو ایسی مٹی میں آنکھ کھولتے ہیں کہ جو خود ریزہ ریزہ ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے خیالات بھی ریزہ ریزہ اور انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں۔

اسی طرح دنیا بھر کے ادب میں وہاں پر موجود ماحولیاتی استعارے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ پاکستانی ادب کی بات کی جائے تو اس ادب میں بھی اسی طرح مختلف علاقوں سے نسبت رکھنے والے ادبا کے باعث مخصوص ماحولیاتی استعارات کا استعمال نظر آئے گا۔ سندھ اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ادبا کے ادب میں سمندری ساحلوں کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ صحرا اور ریگستان بھی سب سے لازمی اجزا ہیں۔

پنجاب سے تعلق رکھنے والے ادبا اپنے گرد و پیش میں موجود تا حد نظر کھیتوں اور ان میں اگی ہوئی فصلوں کو اپنے ادب میں جگہ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ادب میں مقامی دریاؤں ندی نالوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان پرندوں اور جانوروں کا تذکرہ ملتا ہے جوان کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔

خیبر پختون خوا اور شمالی علاقہ جات ، آزاد کشمیر، گلگت بلتستان وغیرہ کے ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوکر وہاں کی خوب صورتی اور زندگی کے مسائل کو اپنے ادب میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے ادب میں وادیوں، سرسبز جنگلات، فلک بوس پہاڑوں، نوع بہ نوع درختوں اور جانوروں کا تذکرہ ملتا

ہے۔ جو کہ سخت موسمی حالات کے حامل ہیں۔ اس لیے وہاں کے لوگ بھی سخت جان اور جفاکش ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے ادب میں بھی ہمیں ماحولیاتی عناصر کو بہ کو نظر آتے ہیں۔

ادیب اپنے علاقے کے ماحول سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اپنے علاقے کے ماحولیاتی تغیرات پر نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب میں ماحولیاتی پیش کش پیش پیش نظر آتی ہے۔ کوئی بھی ادب چاہے وہ جس بھی زبان میں تخلیق کیا جائے وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے جس بھی زبان کے ادب کی بات کی جائے گی وہ لازماً اپنے ماحول سے متاثر نظر آئے گا۔ ہر علاقے کے ماحولیاتی اور مقامی استعارے رہن سہن، تہذیب و ثقافت غرض یہ کہ ہر چیز سے متاثر نظر آتے ہیں کیوں کہ ادب معاشرے کا عکس ہوتا ہے اس لیے ادب میں بھی سماج کا ہر رنگ موجود ہوتا ہے جس کی تخلیق میں ماحول اور ماحولیاتی عناصر پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ادب سماج کے تابع ہوتا ہے۔ یعنی سماج میں جو کچھ رو نما ہو رہا ہوتا ہے ادب اسی کا عکس ہوتا ہے۔ ادب سماج سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں اسی طرح سماج ماحول کے تابع ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد میں ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس کی تہذیب و ثقافت بھی ماحول کی دین ہی ہوتی ہے۔ گویا ماحول سماج کو اور سماج ادب کو جنم دیتا ہے۔ یوں ہر ایک ادب بنیادی طور پر ماحول کی ہی عطا ہوتا ہے۔

II ماحولیات:

ماحولیات کا لفظ ماحول سے نکلا ہے جس کے معنی ماحول اور اس سے جڑی چیزوں کا مطالعہ کہ جس میں ہر ایک جان دار آباد ہے۔ یہاں گرد و پیش میں کئی دوسرے جاندار اور بے جان عناصر پائے جاتے ہیں جن کی موجودگی اور عدم موجودگی انسانی زندگی پر پوری طرح سے اثر ڈالتی ہے۔ اگر ہم ان تمام عناصر کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز دوسری چیز سے وابستہ ہے ہر ایک چیز کا وجود دوسری چیز کے وجود کے لیے لازمی ہے۔ یہی مطالعہ کون سی چیز اس جہان میں موجود ہے اور کون سی چیز موجود نہیں ہے؟ کون سی چیز زیادہ مقدار میں موجود ہے اور کون سی

چیز کس مقدار میں موجود ہے ؟ماحولیات کہلاتا ہے سائنسی طریقہ کار سے ماحول کی تمام تر اکائیوں کا مطالعہ کرنا ماحولیات کہلاتا ہے۔

ماحولیات میں مختلف جان داروں اور بے جانوں کے آپسی تعلقات کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ کیا جاتا ہے کہ ماحول کا ان پر کیا اثر پڑتا ہے یا ماحول کے زیر اثر رہنے سے ان پر کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں ہیں؟ کسی علاقے کے ایک عنصر کی آبادی بہت زیادہ ہے تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اسی جگہ پر اس کسی ماحولیاتی عنصر کی کمی ہے تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

جن جگہوں پر کوئی بھی ماحولیاتی عنصر موجود ہوتا ہے وہاں پر کئی طرح کے وسائل موجود ہوتے ہیں جو کسی بھی جاندار کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ ایک جاندار انھی خصوصیات کی بنا پر کسی جگہ کو اپنا مسکن بنا تا ہے۔ اس کا یہ مسکن دو طرح کے وسائل سے مل کر بنتا ہے ۔ ایک وسائل تو وہ ہوتے ہیں جو دوبارہ تجدید کیے جا سکتے ہیں۔ جن کو دوبارہ سے تخلیق کیا جا سکتا ہو۔ دوسرے وسائل وہ ہوتے ہیں جن کی تجدید ممکن نہیں ہوتی یا جن کو ایک بار استعمال کر لیا گیا تو وہ دوبارہ کسی بھی طرح کے استعمال کے قابل نہیں رہتے۔

ان تمام تر عوامل کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی حیاتیاتی عنصر اپنے مسکن اور اس کی تبدیلی کے بارے میں سوچتا ہے۔ پرندے موسمی طور پر کسی جگہ کو اپنا مسکن بنا تے اور مخصوص مدت کے بعد اس جگہ کو چھوڑ کر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ وہ عوامل کیا ہو سکتے ہیں؟ وہ کس طرح پرندوں پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ ان تمام تر چیزوں کے جواب دینے کے لیے ماحولیات کے شعبے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ماحول کی تمام اکائیوں کا آپسی تعلق اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ ماحولیات کہلاتا ہے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر چیز اپنے ماحول سے متاثر ہوتی ہے۔ کوئی بھی شے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان بھی موسم کے مطابق کے ماحول سے مطابقت دینے کے لیے مختلف حل تلاش کرتا ہے۔ وہ سردیوں میں اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیے گرم کپڑوں، گرم غذاؤں وغیرہ کا استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت سی احتیاطی تدابیر کرتا ہے۔

گرمیوں کے موسم میں وہ اس کے برعکس خود کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے مختلف حیلے تلاش کرتا ہے۔ گرمی میں انسان ایسی غذا استعمال کرتا ہے جن کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ایسے لباس کا استعمال کرتا ہے جس میں راحت اور ٹھنڈک محسوس ہو۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی احتیاطی تدابیر کی جاتی ہے اسی طرح خزاں اور بہار کے موسم میں بھی تمام جانداروں سمیت انسان بھی اپنے آپ کو ماحول اور ماحولیاتی عوامل سے مطابقت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان حیوان ناطق ہونے کے باعث اپنے جذبات، خیالات اور محسوسات کو دوسرے انسانوں تک پہنچا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے اپنی ابتدا سے لے کر اب تک ترقی کی کئی منازل طے کی ہیں۔ انسان کی ترقی کا یہ سفر ابھی تک جاری و ساری ہے۔ اس کی بنیاد میں دیکھا جائے تو ماحولیاتی عوامل اور ماحولیاتی دباؤ ہی کار فرما نظر آتا ہے۔ انسان کی ترقی کے پیچھے نطق کارفرما ہے۔ اسی صلاحیت کے باعث انسان وحشی درندوں سے محفوظ رہا بل کہ پیغام رسانی کا کام بھی سرانجام دیتا رہا ہے۔ زبانوں کی تخلیق اور ماحول کے رشتے کے بارے میں خلیل صدیقی رقمطراز ہیں:

> بنی نو انسان نے اپنی تاریخ کے دوران ان گنت زبانیں تخلیق کی ہیں۔ اس کا یہ تخلیقی عمل متعدد تجربات کی منزلوں سے گزرتا رہا ہے۔ انسان اور زبان کا رشتہ اتنا ناگزیر ہے کہ زبان کے بغیر انسان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن انسان فطرت کے چیلنج کا جواب دینے اور فطرت کی اندھی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی اخلاقی اور مادی اکتسابات کرتا رہا ہے ان کے نتیجے میں وہ خود بھی بدلتا رہا ہے۔ زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کے اکتسابات بھی بدلتے رہے ہیں اور وہ روایتیں وجود میں آتی رہی ہیں جو ثقافت، زبان، فن اور علم کی حیثیت سے ابھرتی رہی ہیں اور ان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں جو عناصر ماضی کے دھندلکوں سے دھندلا نہ سکے وہ عصری تقاضوں سے عہدہ برآں ہونے کے لیے نئے روپ دھارتے رہے۔ ان میں اضافے بھی ہوتے رہے۔ اضافے نے انھیں کچھ کا کچھ بھی بنا دیا لیکن جن عناصر میں اتنی تابناکی نہ تھی کہ ماضی میں تھوڑا بہت چمک سکیں اور عصری تقاضوں کی کسوٹی پر پورے اترے سکیں گہرے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ انسانی زبانوں کا بھی یہی مقدر رہا ہے۔ انسان کی انفرادی ضرورتیں اور ان کے سماجی

تقاضے اظہار و ابلاغ کی بہت سی صورتوں کا تجربہ کرتے رہے ہیں اور ان تجربات کے نتیجے میں نت نئی بولیاں تشکیل پاتی رہی ہیں۔[۵]

اس بات میں بھرپور صداقت موجود ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ اس لیے انسان کو لازمی طور پر باقی لوگوں سے رابطے میں رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے اسے تمام تر معاملات کو چلانے کے لیے باقی لوگوں تک اپنی رائے پہنچانے کی ضرورت پڑتی ہے یا ان سے کوئی مشورہ طلب کرنے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان تمام باتوں کو زبان سے ادا کرے اور سامنے والا ان باتوں کو کان سے سنے۔ بل کہ ہر وہ ذریعہ جس کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک انسان دوسرے انسان تک اپنے مافی الضمیر کو پہنچا سکے زبان ہی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

انسان ابتدا ہی سے ترسیل و ابلاغ کا عادی ہو گا کیوں کہ ترسیلِ خیالات ہی سے سماج کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ خیالات کی ترسیل اور جذبات کے اظہار کے لیے انسان نے زبان کی ایجاد کی۔ ترسیل نطق ہی کے ذریعے سے نہیں ہوتی بل کہ یہ اشاروں کے ذریعے بھی ممکن ہے۔ اشاروں کا استعمال ازلی اور آفاقی ہے۔ اتنا مہذب ہو جانے کے بعد بھی انسان اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اشاروں سے بے نیاز نہیں۔[۶]

جب انسان نے زبان ایجاد کر لی تو پھر اس نے اپنے گرد و پیش میں ہونے والی تبدیلیاں اور ان کے پسِ پشت موجود عناصر پر بھی اپنی رائے محفوظ کی۔ اس کی رائے مشاہدات، تجربات، خیالات، احساسات اور جذبات کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ انسان جس چیز کو بھی الگ یا منفرد پاتا ہے تو باقی تمام لوگوں کو بھی بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سیاح سیر کے دوران میں ہونے والے واقعات اور مناظر کو نہایت عمدہ انداز میں تحریر یا بیان کرتا ہے تا کہ جس سے وہ محظوظ ہوا باقی لوگ بھی اس سے حظ اٹھا سکیں۔ جس چیز نے اسے گزند پہنچایا یا تکلیف دی باقی لوگ بھی اس سے آگاہ رہیں اور اس سے دور رہیں۔ الغرض جب انسان نے اپنے جذبات و احساسات کو اپنے تجربے یا تخیل سے ملا کر پیش کیا تو اس کا تخیل ہی ادب کہلایا۔ ادیب سماج میں موجود تمام عوامل کا بغور جائزہ لیتا ہے اور بعد ازاں اس کے ساتھ اپنے تخیل کی طاقت کو ملا کر ایک دل کش تخلیق سامنے لاتا ہے جو اس سماج کے ہر شخص کے دل کی ہی آواز ہوتی ہے۔

III ماحولیاتی تنقید اور اس کے عناصر:

ماحولیاتی تنقید کے لیے انگریزی زبان میں Ecocritism کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ انگریزی میں environmental criticism کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ لفظ Eco کے معنوی گہرائی اور گیرائی environment سے زیادہ ہیں جس کی وجہ سے کی اصطلاح Ecocritism کو قبول عام حاصل ہوا اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ماحول معروف ماحولیاتی نقاد شیرل گلاٹ فیلٹی لکھتی ہیں:

> In its connotations, enviro- is anthropocentric and dualistic, implying that we humans are at the center, surrounded by everything that is not us, the environment. Eco-in contrast, implies interdependent communities, integrated systems, and strong connections among constituent parts.[۷]

یعنی ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ ایکو میں موجود انسانوں سمیت تمام چیزیں ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ان کی ایک دوسرے پر انحصاری ایک حیاتیاتی معاشرے کو جنم دیتی ہے۔ اس طرح ہمارے گرد و پیش میں موجود ہر چیز دوسری چیز کے لیے لازم و ملزوم ٹھہرتی ہے۔ ہر شے حیاتیاتی معاشرے کی بنیاد میں اپنا برابر حصہ اور کردار رکھتی ہے۔ اس لیے درجہ بندی میں بھی تمام تر چیزوں کو بشمول انسان ایک ہی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ ماحولیاتی تنقید بشر مرکزیت سے انحراف کرتے ہوئے ارض مرکزیت کی بات کرتی ہے اس لیے ہم ماحولیاتی تنقید کو ایکو کریٹی سزم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایکالوجی سے کیا مراد ہے؟ لارنس بیول اس کے لغوی معنی یوں تحریر کرتے ہیں:

> Ecology" derives etymologically from the Greek oikos, household, and in modern usage refers both to "the study of biological interrelationships and the flow of energy through organisms and inorganic matter.[۸]

یعنی ہم آسان الفاظ میں یہ کہ سکتے ہیں کہ ایکو کا لفظ یونانی لفظ ایکوس سے نکلا ہے جس کو علم الانسان اور گھرانے کے علم کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا تا ہم بعد ازاں اس لفظ کو حیاتیاتی معاشرے کے علم کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ ماحولیاتی تنقید کے لیے Eco criticism کی اصطلاح سب سے پہلے ولیم روئیکروٹ نے اپنے ماحولیاتی تنقیدی مضمون literature and Ecology : An experiment in Ecocriticismمیں استعمال کی ان کے مضمون کا عنوان ہی اس بات کا عکاس ہے کہ وہ ماحولیاتی تنقید کو ایک تجربے کے طور پر ادب میں متعارف کروا رہے تھے۔ ایک ہی سماج میں رہتے ہوئے تمام تر چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ایک ربط میں مربوط ہوتی ہیں۔ ایسے حالات میں سارے موجودات جو زمین پر موجود ہیں ایک گھرانے کا منظر پیش کرتے ہیں۔ لفظ Eco اس پورے گھرانے کا احاطہ کرتا ہے جس میں حیوانات نباتات اور جمادات شامل ہیں۔ یہ خالص سائنسی اصطلاح ہے اس کو ادبی بنانے کے لیے اس کے ساتھ criticism کے لفظ کو بطور لاحقہ لگا دیا گیا ہے۔ جب Eco اور criticism کی اصطلاحات کو ملایا جاتا ہے تو Ecocriticism کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ جس کے لیے اردو ادب میں ماحولیاتی تنقید کی اصطلاح مستعمل ہے۔

جس طرح ecology موجودات کے آپسی تعلقات کے علم کا نام ہے بالکل اسی طرح ماحولیاتی تنقید ماحول کے ادب پر ہونے والے اثرات کے جائزے کا نام ہے۔ ماحولیاتی تنقید میں نقاد ماحول سے اثر انداز ہونے والے ادب کی نشاندہی کرتا ہے اور اس ادب کو ماحولیاتی تناظر میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔

جس طرح موجودات کے مابین تعلق پیچیدہ ہے۔ اسی طرح ادب اور ماحول کے درمیان تعلق بھی وسیع ہے۔ ادب اور ماحول کے مابین موجود تعلق کو کسی یک سطری تعریف میں بیان کرنا نا ممکنات میں سے ہے۔ ماحولیاتی تنقید ماحول اور ادب کے رشتوں کی بحث کو چھیڑتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید ادب میں موجود ماحولیاتی پکار کا تعین کرتی ہے اس کے مطالعہ میں ایک قاری اور نقاد ادب کی تشریح و توضیح اسی نقطہ نظر سے کرتے ہیں اس حوالے سے شیرل گلاٹ فیلٹی لکھتی ہیں:

> Ecocriticism is the study of the relationship between literature and the physical environment. Just as feminist criticism language and literature from a gender-conscious perspective, and Marxist criticism brings an awareness of modes of production and economic class to its reading of texts, Ecocriticism takes an earth-centered approach to literary studies.[۹]

یعنی ماحولیاتی تنقید فن پارے میں ادب اور ماحولیات کے درمیان رشتے کی نوعیت کا اندازہ لگاتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید تانیثیت اور ترقی پسندیت کی طرح ہی ایک فکر کا نام ہے جس میں صرف اور صرف اپنے نظریے اور فکر کو ہی مرکز و محور رکھا جاتا ہے۔ جس طرح تانیثی نقطہ نظر ایک فن پارے کی زبان اور جنسی کشمکش کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ بیان کرتا ہے اور ایک مارکسی نقطہ نظر رکھنے والا نقاد طبقاتی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے اور نظام زر کو مسائل کی وجہ گردانتا ہے اسی طرح ایک فن پارے میں موجود ماحولیاتی پیش کش کو ماحولیاتی نقاد بھی دیکھتا ہے۔ وہ باقی تمام چیزوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف اور صرف ماحولیات کی پیش کش کو مد نظر رکھتا ہے جے اے کڈن ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> Eco-criticism A field of criticism defined by its attempt to delineate the relationship between literature and the natural environment.[۱۰]

یعنی تنقید کی وہ شاخ جو صرف فطری ماحول اور ادب کے درمیان رشتوں کی پہچان اور وضاحت کرتی ہے ماحولیاتی تنقید ہے۔ جے اے کڈن نے مختصر مگر جامع انداز میں ماحولیاتی تنقید کی تعریف کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی تنقید کی ڈومین کا بھی بتا دیا ہے۔ ان کے نزدیک ماحولیاتی نقاد ادب میں موجود صرف اسی ماحولیاتی پیش کش کو در خور اعتنا جانتا ہے کہ جس میں مصنف نے اس قدرتی ماحول کو ادب کا حصہ بنایا ہوا ہے جو خود کار طریقہ کار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جس میں ہر چیز فطری انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ جہاں زندگی خود رو ہے۔ اس پر کسی قسم کا انسانی تسلط

موجود نہیں ہے۔ ایک ایسا حیاتیاتی معاشرہ تشکیل پایا ہوا ہے جس میں کسی بھی ثنویت کا شائبہ موجود نہیں۔ ٹموتھی کلارک لکھتی ہیں:

> Ecocriticism usually reads literary and environmental texts with these competing cultural conceptions of nature to the fore. At the same time, a definitive feature of the most challenging work is that it does not take the human cultural sphere as its sole point of reference and context.[11]

ماحولیاتی تنقید ادب کے مطالعے میں قطعی طور پر انسان کو کائنات کا مرکز و محور ماننے سے قاصر رہتی ہے۔ یہ تنقید انسانی ثقافتی دائرے سے بھی اتفاق نہیں کرتی۔ ماحولیاتی تنقید میں کسی قطعۂ ارضی کی حالت کا ذکر ہو سکتا ہے۔ انسانی ترقی کے نام پر اس میں ہونے والی تباہی کا نوحہ ہو سکتا ہے۔ یہ زمین پر افسوس بھی ہوسکتا ہے۔ جس پر انسانی تسلط یا یلغار کے بعد تباہی کا سامان پیدا ہو گیا اور اس جگہ کا حسن جزوی یا کلی طور پر ماند پڑ گیا۔ اس علاقے کا مرکزی کردار کوئی بھی ماحولیاتی آبجیکٹ ہوسکتا ہے۔ جس میں کوئی جانور، پرندہ، دریا، صحرا وغیرہ مرکزی نقطے کا حامل ہو سکتا ہے۔ چناں چہ ٹموتھی مارٹن لکھتی ہیں:

> Conventional ecocriticism is heavily thematic. It discusses ecological writers. It explores elements of ecology, such as animals, plants or the weather.[12]

اس کی پیش کش کی دو صورتیں وضع ہوتی ہیں۔ اول تو یہ کہ فطرت کی ان راعنائیوں کی نوحہ گری جو انسانی ترقی کی نذر ہو گئیں یا پھر ان فطری عوامل کا تذکرہ جن کے باعث ماحولیاتی عوامل ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس بات کو کلی طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ فطرت نگاری کا ادب کے ساتھ مل کر پیش ہونا ماحولیاتی تنقید کے زمرے میں آتا ہے تو دوسری طرف یہ سوال بھی ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ

اس سے پہلے بھی تو ادب میں ماحولیاتی پیش کش موجود رہی ہے۔ جب کہ ماحولیاتی تنقید کو جدید تنقیدی نظریے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں لارنس بیول لکھتے ہیں:

> Environmental criticism strives to move the notion of environment from abstraction to a tangible concern.[۱۳]

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ماحولیاتی تنقید صرف اسی ادب کی بات کرتی ہے جو مجرد صورت میں نہ ہو بل کہ مبنی بر حقیقت ہو۔ ہمارے ادب میں زیادہ تر باتیں تخیلاتی اور تصوراتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ماحولیاتی تنقید کو یہ قدم اٹھانا پڑا کہ وہ ان تخیلاتی اور تصوراتی باتوں سے نکل کر حقیقت کی طرف راغب ہو۔ ایک ماحولیاتی نقاد ان تمام چیزوں کو نظر میں رکھتے ہوئے صرف اور صرف حقیقت پر مبنی ادب کو ہی تصور کرتا ہے۔ ہمارے قدیم ادب جس میں داستانیں اور مثنویاں وغیرہ شامل ہیں، ان میں تمام کا تمام ماحول حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ دیو پریوں کی کہانیاں اور جنوں کی داستانیں یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔

یعنی قدیم ادب میں ہونے والی منظر نگاری میں ماحولیاتی منظر نگاری کے بارے میں ہم ہی کہ سکتے ہیں کہ وہ تخیلاتی منظر نگاری ہوا کرتی تھی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس وجہ سے ماحولیاتی تنقید کی ضرورت دور جدید میں بڑھ جاتی ہے کہ یہ صرف حقیقت کو ہی تسلیم کرتی ہے۔ یہ تنقید ہر ایک باطل نظریے کی نفی کرتے ہوئے صرف اور صرف حیات مرکزیت کی طرف راغب ہوتی ہے۔ کرۂ ارض کو ہی اپنا مرکز و محور سمجھتی ہے۔ اس تنقید میں بشر مرکزیت کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں جس کی وجہ سے ہم اسے حقیقی تنقید سمجھتے ہیں اور یہ ادب کو پرکھنے کا بالکل نیا انداز اور معیار ہے۔

ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے اوراقِ گزشتہ میں ضروری بحث کی جا چکی ہے۔ جس طرح ہر ایک تنقیدی نظریے کا دائرہ کار اور مخصوص میدان ہوتا ہے اسی طرح ماحولیاتی تنقید کا بھی ایک دائرہ کار ہے جس میں اس کی مختلف اصطلاحات شامل ہیں۔ یہ اصطلاحات در اصل وہ شاخیں اور میدان ہیں جن پر ماحولیاتی تنقید انحصار کرتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اصطلاح اپنے اندر جامعیت اور کلیت رکھتی

ہے۔ ہر ایک اصطلاح ادب کی مختلف انواع پر اپنا نقطہ نظر محفوظ رکھتی ہے۔ ذیل میں ماحولیاتی تنقید کی ان اصطلاحات کو شامل کیا جاتا ہے۔

بن نگاری: (wilderness writing)

بن کے لفظی معنی جنگل کے ہیں۔ جو انگریزی اصطلاح wild کے قریب ترین ضرور ہیں مگر اس کی جامعیت اور کلیت کے لیے نا کافی ہیں۔ تا ہم wild کے لفظی معنی سرکش، وحشی یا مشتعل کے ہیں۔جس کو اردو زبان میں جنگلی بھی کہا جاتا ہے۔ تاہم تنقید کی اصطلاح wilderness کے مترادف کے طور پر بن نگاری کی اصطلاح کو رائج کیا گیا ہے۔ بن نگاری سے مراد ادب پارے میں کسی ایسے ماحول کی تصویر کشی کرنا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہے۔ جس پر انسان اپنا تسلط نہ جما پایا ہو۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے زمین پر اپنی ہستی کی موجودگی کے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ تا ہم پھر بھی ایسی جگہیں موجود ہیں کہ جہاں پر انسان نے اپنی ہستی کے کوئی خاطر خواہ نشانات نہیں چھوڑے۔ یا یوں کہیے کہ باوجود کوشش کے انسان ایسا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ بن نگاری میں ہم ایسے ماحول کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جس پر انسانی تہذیب و ثقافت نے اپنے اثرات مرتب نہیں کیے اور وہ جگہ محفوظ رہی۔ فطرت اس جگہ اپنی اصل حالت اور کیفیت کے ساتھ موجود ہے۔ جہاں پر زندگی اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ ادبی بن نگاری میں ایک ایسے ماحول کی تصویر کشی کی جاتی ہے جس میں فطرت نگاری کو انسانی تہذیب و تمدن پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک ادبی بن نگار اس آباد کاری کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ٹموتھی کلارک نے اس حوالے سے ان الفاظ میں مختصر رائے پیش کی ہے کہ:

> The term stresses that element of anything that is resistant to human control, prediction or understanding the unmanagedenergy of nature.[۱۴]

اس تعریف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی بن نگار اپنے کسی فن پارے میں ایسے ماحول یا ان کے عناصر کا ذکر کرے کہ جن پر انسانی دست رس نہیں ہے اس کو ماحولیاتی تنقید میں بن نگاری کہا

جاتا ہے۔ بن نگاری میں ماحول کے ہر ایک عنصر کی بات کی جاتی ہے۔ سیلاب، زلزلہ، طوفان وغیرہ بھی ماحولیاتی تنقید کی رو سے بن نگاری کے زمرے میں آئیں گے۔

بشر مرکزیت: (Anthropocentrism)

بشر مرکزیت کا نظریہ زمانہ قدیم سے ہی انسان کے ساتھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان میں کافی زعم ہوگیا کہ اس کائنات کی ہر چیز اس کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ بشر مرکزیت ایسا نظریہ ہے کہ جس کے مطابق اس کائنات کی تخلیق کی وجہ انسان ہی ہے۔ انسان جس طرح چاہے اس کو استعمال کرے۔ چاہے اس کے لیے اسے ماحول میں جس طرح کی تبدیلی کرنا پڑے وہ اس سے گریز نہ کرے۔ اسی وجہ سے انسان نے دھرتی پر اپنی من مانی کی اور زمین میں اکھاڑ پچھاڑ کی جس کے باعث یہاں کا ماحول بری طرح سے متاثر ہوا۔ انسان اس جہان کی ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے پر قدرت رکھتا ہے اور اس سے بڑھ کر اس کو اپنا حق بھی سمجھتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید اس نظریے کی نفی کرتی ہے چناں چہ ٹموتھی کلارک لکھتی ہیں:

> Anthropocentrism names any stance, perception or conception that takes the human as center or norm. An 'anthropocentric' view of the natural world thussees it entirely in relation to the human, for instance as a resource for economic use, or as the expression of certain social or cultural values – so even aesthetics of landscape appreciation can be anthropocentric. [۱۵]

اس اقتباس کی رو سے انسان کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے اس لیے انسان ہی مرکز حیات ہے کسی بھی تہذیب و ثقافت یا قدر کے لیے انسانی حقوق کی بجا آوری لازم ہے۔ اس اقتباس کے آخر میں ٹموتھی کلارک نے جس پیش کش کا ذکر کیا ہے وہ سب سے زیادہ اہم ہے کہ انسان ہر چیز کو اپنے حساب اور اپنے نقطہ نظر کے مطابق دیکھتا ہے۔ اس لیے قدیم فطرت پسندی کے نظریے اور ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بشر مرکزیت کی یہ اصطلاح ماحولیاتی تنقید کے نقطہ

نگاہ سے کلی طور پر ماحولیاتی تنقید کی تفہیم کے باعث اسے ماحولیاتی تنقید کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

حیات مرکزیت: (Biocentrism)

حیات مرکزیت کی اصطلاح بشر مرکزیت کا رد عمل ہے۔ جس کے مطابق اس جہان میں موجود زندگی ہی مرکز ہے۔ زندگی چوں کہ زمین پر موجود ہے اس لیے زمین کو زندگی کی وجہ سے مرکز قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی اس جہان میں موجود زندگی اور ماحولیاتی عناصر کی وجہ انسان نہیں ہے بل کہ ارتقا کا وہ عمل ہے جو ہر وقت ہو رہا ہے۔ جس نے ابتدا سے اب تک خود کو تبدیل نہیں کیا بل کہ بدستور موجود ہے۔ ادبی تناظر میں ہر اس انسانی عمل کے خلاف ردعمل ظاہر کرنا کہ جو باقی ماحولیاتی عناصر کے لیے مضر ہو حیات مرکزیت ہے۔ اس نظریے کے مطابق کوئی بھی مخلوق بالخصوص انسان کسی دوسری مخلوق سے افضل و اشرف نہیں ہے بل کہ یہ بھی باقی مخلوقات کی طرح ہی ماحول کا ایک عنصر ہےلارنس بیول تحریر کرتے ہیں:

> Biocentrism The view that all organisms, including humans, are part of a larger biotic web or network or community whose interests must constrain or director governs the human interest. Used as a semi-synonym for ecocentrism and in antithesis to anthropocentrism.[۱۶]

ہم بجا طور پر یہ کہ سکتے ہیں کہ انسانی با لادستی اور آمریت کے خلاف ماحولیاتی عناصر کے حق میں کی جانے والی ادبی پیش کش کو حیات مرکزیت کہا جاتا ہے۔ کسی بھی ماحولیاتی عنصر کے حق میں ہونے والی ادبی پیش کش حیات مرکزیت ہے۔ کسی بھی ماحولیاتی عنصر کے استحصال کے خلاف ادبی پیش کش حیات مرکزیت ہی ہے۔ اسی ادبی نظریے میں باقی ماحولیاتی عناصر کے حقوق کی بات بھی کی جاتی ہے۔

مظاہر پسندی: (Animism)

جب ہم کائنات کے گوشے گوشے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر چیز متحرک نظر آتی ہے۔ یہ حرکت بعض اوقات زندگی اور بعض اوقات وجہ زندگی ہوا کرتی ہے۔ حرکت ہر ایک جان دار کا لازمی فعل ہے۔ ادب میں کسی بے جان ماحولیاتی کو عنصر کو جاندار بنا کر پیش کرنا مظاہر پسندی کہلاتا ہے۔ مظاہر پسندی میں ایک ادیب اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ہر چیز کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ بھی انسانوں کی طرح اپنے جذبات و احساسات رکھتی ہے۔ اس کے جذبات و احساسات بالکل اسی طرح ہیں کہ جس طرح انسان کے جذبات و احساسات ہوا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے گریگ گیئرڈ لکھتے ہیں:

Animism belief that natural objects and phenomenas have spirits.[۱۷]

اس نظریے کے مطابق کسی بھی شے کو جاندار بنا کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے خوشی کے وقت خوشی اور غم کے وقت پریشانی کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے ۔ جب کوئی ادیب کسی ماحولیاتی عنصر کو اس نظر سے دیکھتا ہے تو اسے کائنات کی ہر چیز ذی روح نظر آنے لگتی ہے۔ کائنات کی بے جان چیزیں جاندار معلوم ہونے لگتی ہیں اور وہ ان کے حقوق کی پاس داری کرنے لگتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد انسان بقیہ ماحولیاتی عناصر کے حقوق کے بارے میں بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مقاماتی ادب: (Literature of Place)

مقاماتی ادب کی اصطلاح مقام سے نکلی ہے یعنی ایسا ادب جس میں کسی جگہ کے بارے میں کچھ تخلیق کیا گیا ہو۔ کسی جگہ یا مقام کے بارے میں اس طرح تحریر کرنا کہ اس میں ماحولیاتی عناصر کی بھی وضاحت ہو جائے۔ اس کے علاوہ ماحولیاتی عوامل کی خصوصیات کو بھی مقام کے ساتھ پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مقامی اور مقاماتی ادب میں فرق ہے۔ مقامی ادب میں کسی علاقے میں کسی علاقے کی تہذیب و ثقافت پیش کی جاتی ہے جب کہ مقامات

ادب کسی مخصوص علاقے یا جگہ کے بارے میں تخلیق کیا جانے والا ادب ہے جس میں ایک مخصوص علاقے کے ساتھ ساتھ اس کی ماحولیاتی پیش کش بھی موجود ہوتی ہے۔ جاس سمتھ لکھتے ہیں:

> In this sense the literature is read as itself an experiment in place with the potential to feed into the cultural life of that place, especially in light of the fact that so many of the authors are themselves also engaged with activities of grassroots environmentalism or heritage.[۱۸]

اس اقتباس کی روشنی میں ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ مقاماتی ادب میں کسی مخصوص علاقے کے رہن سہن کے طور طریقوں سمیت وہاں کی موسمیاتی تبدیلیوں سمیت ہر ایک چیز کو وسعت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ جس کو پڑھنے والا وہاں کی ہر ایک چیز سے کلی طور پر شناسائی حاصل کر لیتا ہے۔

رعیا نیت:(Pastoralism)

راعیانیت کا لفظ راعی سے نکلا ہے۔ جس کے معنی بھیڑ بکریاں چرانے والے کے ہیں۔ اصطلاح میں آبادی اور زندگی سے اکتا کر دیہی زندگی کو اپنانا اور اس کی ادبی پیش کش میں دیہی زندگی کو شہری زندگی پر ترجیح دینا راعیانیت کہلاتا ہے۔ راعیانیت میں ایک ادیب دیہی زندگی کو سادہ مگر فطرت کے زیادہ قریب ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لارنس بیول لکھتے ہیں:

> Traditional pastoral, dating from the poetry of Theocritus, is a stylized representation of rusticity in contrast to and often in satire of urbanism, focusing in the first instance on the life of shepherds. In the early modern and romantic eras, as in seventeenthcentury English country house poems and in Wordsworthian lyric, pastoral become more mimetically particularized, and more given over to representation of country ways that are being displaced by enclosure and/or urbanization.[۱۹]

ادب کی اس پیش کش میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ادیب ایسے کردار تخلیق کرتا ہے جو اپنے ماحول کو نقصان پہنچائے بغیر اس کے عناصر کے ساتھ مل کر زندگی گزارتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق کوئی بھی ماحولیاتی عنصر کسی دوسرے ماحولیاتی عنصر کے استحصال کے بارے میں نہیں سوچتا بل کہ اس کے ساتھ رہ کر زندگی گزارتا ہے۔

حیاتیاتی معاشرہ:(Bio Community)

ایک ایسا معاشرہ جہاں پر ایک سے زیادہ انواع کے جاندار آباد ہوں حیاتیاتی معاشرہ کہلاتا ہے۔ زمین پر آباد تمام جاندار ایک تعلق کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ ان کا یہ آپسی تعلق بقائے باہمی کی وجہ سے قائم ہے۔ بقائے باہمی کی کڑی ہی تمام جانداروں کو آپس میں ملائے رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے جاندار ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرے پر انحصار کرنا اور پھر ایک ہی معاشرے میں آباد ہونا حیاتیاتی معاشرے کو جنم دیتا ہے۔ اس کرہ ارض پر ہر طرف جاندار ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی رہتے ہیں۔ لہذا اس زمین کو حیاتیاتی معاشرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حیاتی مقامیت: (Bio Regionalism)

حیاتیاتی مقامیت سے مراد ایسا علاقہ جہاں کے حالات و واقعات ایک جیسے ہوں ایسے علاقے کے جن کے موسمی حالات ایک جیسے ہوں ایک جیسے جغرافیائی عوامل حیاتیاتی مقامیت کی ذیل میں آتے ہیں۔ جس طرح انسانی بستیوں میں رنگ، نسل، قبائل، علاقے، زبان اور تہذیب و ثقافت کی بنا پر ایک علاقے کو دوسرے علاقے سے منفرد یا الگ مانا جاتا ہے اسی طرح ماحولیاتی تنقید میں بھی کچھ جگہوں کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ خاص علاقے خاص زبان اور خاص طرح کے لوگوں کو ایک اکائی مانا جاتا ہے اسی طرح کسی مخصوص علاقے میں موجود ایک جیسے ماحولیاتی نظام کو کہ جس میں ایک ہی نوع کے جاندار آباد ہوں انھیں ایک اکائی جاتا ہے۔ حیاتیاتی مقامیت کے حوالے سے لارنس بیول لکھتے ہیں:

> From the perspective of ecology, a bioregion or ecoregion is a geo graphical area of similar climate where similar ecosystems and

groups of species are found on similar sites. Bioregionalism, however, views a bioregion not only as a territory defined by natural markers, such as watersheds, but also as a domain of consciousness and as a focus of citizenly allegiance that challenges conventional political boundaries. Bioregionalism aspires to respect and restore natural systems while satisfying basic human needs in sustainable ways, believing that geographical units of relatively small scale are likeliest to promote such engagement. [۲۰]

فطرت پسندی کا یہ رجحان انسان کو فطری زندگی کی طرف مائل کرتا ہے یہ بیانیہ دراصل انسان کے بنائے ہوئے نام نہاد رنگ، نسل، سیاست اور مذہب کی بنا پر ہونے والی تقسیم کے خلاف ہے۔ یہ کسی بھی غیر فطری تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ ماحولیاتی تنقید مختلف مسائل کے حل کی تلاش کے لیے حیاتیاتی معاشرے کے نظریے کو ہی بنیاد بناتی ہے۔

ماحولیاتی تانیثیت: (Eco Faminism)

جس طرح حیات مرکزیت کا نظریہ بشر مرکزیت کے رد عمل کے طور پر موجود ہے اسی طرح ماحولیاتی تانیثیت پدر سری سماج کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ جس میں کسی بھی مرد کو کسی عورت کا استحصال کرنے سے روکا جاتا ہے کیوں کہ ایک عورت کا بھی سماج پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ایک مرد کا ہے۔ ماحولیاتی تانیثیت کے حوالے سے ٹموتھی کلارک لکھتی ہیں:

The term ecofeminism has been widely used since the late ۱۹۸۰s to name a growing political, cultural and intellectual movement, both activist and academic. Ynestra King has named it ‘the third wave of the women’s movement’.۱Its defining claim is that the destruction of

the environment and the historical oppression of women are deeply linked.[۲۱]

اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ انسان جہاں باقی تمام مخلوقات کے حوالے سے احساس برتری کا شکار ہے۔ وہیں پر یہ اپنے آپ میں بھی رنگ، نسل، علاقے، حتیٰ کہ جنس کے لحاظ سے بھی احساس برتری کا شکار ہے۔ مرد کی حیثیت سے انسان عورت کو خود سے کم تر اور کمزور سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو بچانے اور برتر ثابت کرنے کے لیے مذہبی تاویلوں کا بھی سہارا لیتا ہے۔ در اصل انسان میں موجود احساس برتری نے اسے اس زعم میں مبتلا کر رکھا ہے کہ یہی وہ واحد مخلوق ہے کہ جو بلا شرکت غیرے اس جہان کی وارث ہے۔ اس کے بیانیے کی زد میں جہاں پر کئی دوسری انواع کی مخلوقات آتی ہیں وہیں پر اس کی نوع کے افراد بھی آ جاتے ہیں۔ ان افراد میں سب سے زیادہ پسا ہوا طبقہ خواتین کا ہے۔ جن کو برس ہا برس سے بندی بنایا گیا ہے اور اب ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ ماحولیاتی تانیثیت ماحولیاتی عناصر کی بات کرتے ہوئے اس مظلوم و محکوم طبقے کی بات بھی کرتی ہے اور اسے بھی برابری کے حقوق فراہم کرنے پر زور دیتی ہے۔

مابعد نوآبادیاتی ماحولیاتی تنقید: (Post Colunial Eco Criticisim)

مابعد نوآبادیاتی تنقید میں در اصل انگریز استعمار کے چلے جانے کے بعد تخلیق ہونے والے ادب ان کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کا ذکر ملتا ہے۔ ما بعد نو آبادیاتی ماحولیاتی تنقید میں ان عوامل پر رنج و غصے کا اظہار کیا جاتا ہے جو نوآباد کاروں کی طرف سے نو آبادیوں پر ڈھائے گئے۔ بنیادی طور پر یہ دونوں نظریات ایک دوسرے سے قریب ترین معلوم ہوتے ہیں تا ہم چند جگہوں پر ما بعد نو آبادیاتی تنقید ماحولیاتی تنقید سے اپنی راہ جدا کر دیتی ہے کیوں کہ ماحولیاتی تنقید حیات مرکزیت کی قائل ہے جب کہ مابعد نوآبادیاتی تنقید بشر مرکزیت کے تحت ہوتی ہے۔

تا ہم نو آبادیاتی ماحولیاتی تنقید میں آباد کاروں کے دیے ہوئے استحصالی نظام کے خلاف بھی پیش کش کی جاتی ہے۔ اس پیش کش میں ماحولیاتی عوامل کو بھی پوری طرح سے مد نظر رکھا جاتا ہے۔ تا کہ ماحولیاتی عناصر کے حقوق کی بات بھی کی جا سکے۔

IV ماحولیات اور اردو ادب:

دنیا کے جس ادب کی بھی بات کی جائے وہ اپنے گرد و پیش کی ہیں اختراع ہوا کرتا ہے۔ یعنی اگر اس ادب کو اسی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بذات خود ماحولیات کے زمرے میں آتا ہے کیوں کہ ہر ایک ادب پر ماحول اور اس کے عوامل کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ در اصل ادب ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اگر اردو ادب کی بات کی جائے تو یہ خاص ہندستانی ماحولیاتی عوامل کے عین مطابق ہے۔ ہندستان میں موجود جغرافیائی رنگا رنگی اور ماحولیاتی و موسمیاتی عناصر اس کو مزید پرکشش بناتے ہیں۔ یہ سرزمین بٹ چکی ہے۔ مگر اس کے باوجود اردو بولنے اور سمجھنے والے اس کے کونے کونے میں موجود ہیں۔

ماحولیات کی بات کی جائے تو اس کی پیش کش قدیم اردو شاعری اور نثر میں ہوتی رہی ہے۔ قدیم اردو شاعری اب کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے اور اس میں سے بعض چیزیں اب ناپید ہو چکی ہیں۔ سب کی سب میں کہیں نہ کہیں ماحولیاتی پیش کش ضرور رہی ہے اگرچہ غزلیہ شاعری عشقیہ موضوعات میں ہی مقید رہی۔ تاہم نظمیہ پیشکش جیسے مثنوی اور مرثیہ وغیرہ میں ماحولیاتی عناصر کو برملا طور پر پیش کیا گیا۔ اردو ادب کی فطرتی شاعری کے باب میں انجمن پنجاب کا گہرا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ انجمن پنجاب کے قیام سے ہی اردو ادب میں موضوعاتی شاعری کو فروغ حاصل ہونا شروع ہوا ہے۔ اس سے قبل زیادہ تر اردو شاعری کے وہی موضوعات تھے جو اس وقت میں سب سے زیادہ مقبول تھے جیسے غزلیہ شاعری میں حسن و عشق، ہجر و وصال کی باتیں، وحدت الوجود اور شہود سمیت دنیا کی بے ثباتی کے موضوعات کو ہی رواج عام حاصل تھا۔ قصیدوں میں زیادہ تر ملک کے بادشاہوں کی تعریف کی جاتی تھی۔ حمدیہ اور نعتیہ نظمیں بھی شاعری کے اہم موضوعات میں شمار کی جاتی تھیں۔ ایسی طویل نظمیں جن میں قصے یا کہانیاں بیان کی جاتی تھیں ان میں ماحولیات کے عناصر کی منظرکشی بھی کی جاتی تھی۔ مثنوی اس دور کی ایسی صنف سخن تھی کہ جس میں ماحولیاتی عوامل کو بھی دخل حاصل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مراثی میں بھی بہت سی جگہوں پر بہت اعلی انداز میں گرد و پیش کے مناظر کی منظر کشی کی گئی جس میں ماحولیاتی عوامل کو بھی دخل حاصل ہوتا تھا۔اس کے علاوہ مرثیے میں بھی بعض جگہوں پر بہت اعلی انداز میں گرد و پیش کے مناظر کی منظر کشی کی جاتی تھی جس میں ماحولیاتی پیش کش کو بھی

دیکھا جاسکتا ہے۔ قدیم ترین مثنویوں میں بھی ماحولیاتی پیش کش موجود رہی ہے۔ ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن ان مثنویوں میں سے ایک ہے کہ جن میں ماحولیاتی عوامل کا ذکر بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں دیگر ماحولیاتی عناصر سمیت مظاہر پسندی کے عناصر بھی مل جاتے ہیں جیسے بادشاہ جب بلبل کو بولنے کا حکم دیتا ہے تو وہ پریشانی کی حالت میں کہتی ہے۔

بھلا ہے دکھ میرا کئی نا سنے تو

اگن کے پھول میرے نہ چنے تو

وہی جانے یو دکھ جس پر کھڑیا ہوئے

جو کئی برہوں کے پھاند میں پڑیا ہوئے۔[۲۲]

اگرچہ اس کی یہ پیش کش سے زیادہ واضح نہیں تا ہم اس میں اس کے دور دھندلے ہی سہی مگر مناظر دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ ایسا اس لیے کہا جا رہا ہے کیوں کہ قدیم اردو مثنویوں میں ماحولیات کی پیش کش خارجیت سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا میر حسن کی مثنوی سحرالبیان میں ماحولیات کی زبردست پیش کش کی گئی ہے جس میں بن نگاری کے عوامل مل جاتے ہیں چند اشعار ملاحظہ کریں:

نہ سمجھو نکلتے ہیں دریا میں سوس

خوشی سے اچھلتے ہیں دریا میں سوس

پرندوں کا دل اس طرف ہے لگا

پرندوں کو دیتی ہے اس کی ہوا

کھڑے ارنے ہوتے ہیں سر جوڑ جوڑ

کہ جی کون دیتا ہے ہدہد کے ہوڑ

خیر اس کی تو سن کر نہ گینڈا چلے

کہ ہاتھی بھی ہو مست اینڈ چلے۔[۲۳]

قدیم اردو مثنویوں میں بھی ماحولیاتی پیش کش کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اردو کی قدیم شاعری میں بھی شعرا منظر نگاری کے فن کے ساتھ ماحولیاتی عوامل کی پیش کش کی اہمیت سے بھی واقف ہوتے تھے۔ ان کی شاعری میں ماحولیاتی عوامل کو فطری حسن کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے۔ دکنی دور کی ایک اور قدیم مثنوی خاور نامہ میں رستمی گرد و پیش کے مناظر کو یوں رقم کرتے ہیں۔

عروسِ بہاراں کرے انجمن

زمیں پر اٹھے لالہ ہورنسترن

زمین پر اٹھے سبزہ ہور آئے جوش

ہوئے جھاڑ اور پاڑ سب سبز پوش

ہر اک جھاڑ یو پھولاں کھلیں

اوسے بلبلاں مدح خوانی کریں

درخت شکوفہ گل افشاں کرے

صباحی کا سارا زر افشاں کرے

درخت جتے سب ہوئے باردار

دیویں پھول ہور میوہ وقت بہار[۲۴]

ماحولیاتی فطرت نگاری کے عناصر اردو کی قدیم مثنویوں میں جا بجا بکھرے ملتے ہیں۔ جہاں کبھی بن نگاری اور کبھی مظاہر پسندی کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ درج بالا اشعار میں شاعر نے بہار کے آنے اور اس کے جانے کے بعد کے حالات کو قلم بند کیا ہے۔ کہ اس طرح بہار کے آ جانے

سے ہر سمت رونق شروع ہو جاتی ہے پھول کھلنے لگتے ہیں تو طرح طرح کے پھل لگنے لگتے ہیں۔ مثنوی گلزار نسیم میں دیا شنکر نسیم ماحولیاتی پیش کش کو خوب نبھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

او باد صبا ہوا نہ بتلا

خوشبو ہی سنگھا کا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے

گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا

جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا[۲۵]

ان اشعار میں گل بکاولی اپنے پھول کے لیے رو رہی ہے اور مختلف حیلوں بہانوں سے پھول کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جس کو دیکھ کر وہاں کے باقی پودے اور جانور بھی انسانی جسم ہونے کی طرح ہی بات کر رہے ہیں۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کی بات کر رہے ہیں گویا یہ مظاہر پسندی کی ایک مثال ہے۔

اردو ادب میں میراثی کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ منظر نگاری مراثی میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔کسی بھی مرثیے کو شروع کرنے کے لیے ایک شاعر چہرہ لکھتا ہے۔ جس میں تمہید باندھتا ہے۔ اس میں ایک شاعر اس منظر کو قلم بند کرتا ہے جو واقعہ کربلا کے روز میدان کربلا کے گرد و پیش میں تھا۔اس میں زیادہ تر چیزیں ماحولیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن کو جدید ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں مراثی کے پہلے حصے کو مبالغہ آرائی ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر جدید تنقید اس کو بھی زیر مطالعہ رکھتی ہے اور اس پر اپنی رائے محفوظ رکھتی ہے کیوں کہ اس میں ماحولیاتی عوامل کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ میر تقی میر کے ایک مرثیے کا ایک بند ملاحظہ کیجیے

مٹی میں بوٹے اٹنے لگے ہیں

اشجار سارے کٹنے لگے ہیں

گل پھول جو ہیں چھٹنے لگے ہیں

جوں ابر تو بھی رو دل لگا کر[۲۶]

انجمن پنجاب کی تحریک نے برعظیم پاک و ہند کے شعرا کو سوچنے اور لکھنے کا ایک نیا زاویہ نظر عطا کیا۔ جس کے مطابق ان شعرا کو اب حسن و عشق کے قفس سے آزادی عطا کرنا تھی۔ اسی لیے موضوعاتی مشاعروں کا آغاز کیا گیا۔انجمن میں سے زیادہ تر مشاعرے فطری عوامل کے حوالے سے ہی تھے۔ انجمن پنجاب کو ہی اردو کی فطری شاعری کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اس تحریک کے بانی نے خود موضوعاتی شاعری شروع کی جس کی وجہ سے بقیہ شعر ابھی اس طرف مائل ہوئے۔ حالی اور محمد حسین آزاد بانیان میں سے تھے۔ جب کہ اس دور کے بقیہ شعرا میں اسماعیل میرٹھی کا نام اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس دور کے شعرا نے اس طرف توجہ نہیں دی تا ہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شعرا کے دلوں میں نظموں کی محبت نے کروٹ لی اور وہ غزل کے مقابلے میں نظم کو ترجیح دینے لگے۔ نظموں میں بلا شبہ فطرت اور فطرت کے عناصر کو شامل کیا جانے لگا۔ ان نظم نگاروں میں اقبال کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی نظمیں ماحولیاتی حوالے سے بہترین نظموں میں سے ہیں۔ ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن[۲۷]

فطرت نگاری کے حوالے سے ایک نہایت اہم نام جوش ملیح آبادی کا ہے۔ ان کی شاعری ماحولیاتی تنقید کے جدید تناظرات کے قریب ترین ہے۔ ان کے اشعار میں جدید زندگی سے بغاوت مصنوعی زندگی سے نفرت اور نام نہاد انسانی اقدار سے بے زاری کے عناصر جا بجا ملتے ہیں۔ ان کے ہاں فطری عناصر کے لیے گہری محبت پائی جاتی ہے۔ وہ ماحولیاتی عوامل کو اپنا رہنما گردانتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

وہ پھیلنا خوشبو کا وہ کلیوں کا چٹکنا

وہ چاندنی مدہم وہ سمندر کا جھلکنا

وہ چھاؤں میں تاروں کی گلِ تر کا مہکنا

وہ جھومنا بندے کا وہ کھیتوں کا لہکنا

شاخوں سے ملی جاتی ہیں شاخیں وہ اثر ہے

کہتی ہے نسیم سحری عید سحر ہے[۲۸]

اس سلسلے میں مجید امجد کا نام باقی شعرا سے منفرد اور نمایاں مقام رکھتا ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں ماحولیاتی عوامل کو نہایت دل کش انداز اور جدید تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں اردو ادب کی بہترین شاعری ہے۔ جس میں انھوں نے بڑے جان دار انداز ماحولیاتی اور فطرتی عوامل کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے اس شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ یہ شاعری ماحول اور انسان کے رشتے کی تفہیم میں موجود ماحولیاتی تنقیدی فکر کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱. ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ ص ۲۱۸

۲۔ ایضاً.

۳ ۔ ایضاً

4-Dr. Y.K Singh, Environmental Science, New Age Publishers, New Delhi, P:1

۵. خلیل صدیقی، زبان کا ارتقا، کلات پبلشر، کوئٹہ ۱۱، ۱۹۷۷۔ ۱۲

۶۔ . گیان چند جین، ڈاکٹر، لسانی مطالعے، ترقی اردو بورڈ، نئی دلی، ۱۹۷۳، ۲۱

7- Cheryll Glotfelty, The Ecocriticism Reader,(edeted by)- Cheryll Glotfelty and Harold Fromm The University of Georgia Press, Athens,1996,.ity of Georgia Press, Athens,1996,.Blackwell Publishing , USA, 2006,Pxi Blackwell Publishing, USA,2006, Pxi

8- Lawrence Buell, The Future of Environmental Criticism, Blackwell, USA, 2005, P13

9- Cheryll Glotfelty, The Ecocriticism Reader,(edeted by)- Cheryll Glotfeltyand Harold Fromm The University of Georgia Press, Athens,1996,.ity of Georgia Press, Athens,1996,P18

10-J.A Cuddon, A Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, 5th Edition, Blackwell Publishing, USA, 2013, P224

11-Timothy Clark, The Cambridge Introduction to Literature and the environment Cambridge University Press, New York , 2011, P6

12- Timothy Morton, Ecology Without Nature, Harvard university press,Cambridge, Massachusetts, and London, England,2007,P2

13.Lawrence Buell, The Future of Environmental Criticism, Blackwell Publishing, , USA, 2005, P29

14- Timothy Clark, The Cambridge Introduction to Literature and the environment Cambridge University Press, New York,2011,P33

15- Timothy Clark, The Cambridge Introduction to Literature and the environment Cambridge University Press, New York,2011,P3

16- Lawrence Buell, The Future of Environmental Criticism, Blackwell Publishing, USA, 2005, P134

17- Greg Garrard, Eco criticism the New Critical Idiom, Rutledge,Abingdon,2004, P183

18- Jos Smith, new nature writing, Bloomsburg, London 2017 21

19-Lawrence Buell, The Future of Environmental Criticism, Blackwell Publishing, USA, 2005, P13

20-Lawrence Buell, The Future of Environmental Criticism, Blackwell Publishing, USA, 2005, P135

21- Timothy Clark, The Cambridge Introduction to Literature and the environment Cambridge University Press, New York,2011 ,P111

۲۲ -ابن نشاطی، پھول بن، ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی،۱۹۷۸ص۱۰۸

۲۳۔ میر حسن، سحر البیان،(مرتب)رشید حسن خان، مکتبہ جامعہ، دہلی س ن، ۲۶۔۲۷

۲۴۔ کمال خان رستمی، خاور نامہ، (مرتب) چاند حسین شیخ، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ۱۹۶۸ص، ۶

۲۵۔ دیا شنکر نسیم، گلزار نسیم، (مرتب) رشید حسن خان، مکتبہ جامعہ، دہلی ۲۰۱۱، ص ۲۷

۲۶۔ میر تقی میر، مراثی میر، (مرتب) سید مسیح زمان سرفراز، قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۱ص ۸۳

۲۷ - محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، عبد اللہ اکیڈمی۔ الکریم مارکیٹ لاہور، ۲۰۰۹ص ۴۱۸

۲۸-جوش ملیح آبادی، کلیات جوش ملیح آبادی فرید بُک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۷ص ۵۹

باب دوم: آزاد کشمیر کی اُردو شاعری میں بن نگاری اور حیات مرکزیت

I بن نگاری:

بن کے لفظی معنی جنگل کے ہیں۔ جو انگریزی اصطلاح wild کے قریب ترین ضرور ہیں مگر اس کی جامعیت اور کلیت کے لیے نا کافی ہیں۔ تا ہم wild کے لفظی معنی سرکش، وحشی یا مشتعل کے ہیں۔جس کو اردو زبان میں جنگلی بھی کہا جاتا ہے ماحولیاتی تنقید میں اصطلاح wilderness کے مترادف کے طور پر بن نگاری کی اصطلاح کو رائج کیا گیا ہے۔ بن نگاری سے مراد ادب پارے میں کسی ایسے ماحول کی تصویر کشی کرنا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہو۔ جس پر انسان اپنا تسلط نہ جما پایا ہو۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے زمین پر اپنی ہستی کی موجودگی کے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ تا ہم پھر بھی ایسی جگہیں موجود ہیں کہ جہاں پر انسان نے اپنی ہستی کے کوئی خاطر خواہ نشانات نہیں چھوڑے۔ یا یوں کہیے کہ باوجود کوشش کے انسان ایسا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ بن نگاری میں ہم ایسے ماحول کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جس پر انسانی تہذیب و ثقافت نے اپنے اثرات مرتب نہیں کیے اور وہ جگہ محفوظ رہی۔ فطرت اس جگہ اپنی اصل حالت اور کیفیت کے ساتھ موجود ہے۔ جہاں پر زندگی اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔

ادبی بن نگاری میں ایک ایسے ماحول کی تصویر کشی کی جاتی ہے جس میں فطرت نگاری کو انسانی تہذیب و تمدن پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک ادبی بن نگار اس آباد کاری کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ٹموتھی کلارک نے اس حوالے سے ان الفاظ میں مختصر رائے پیش کی ہے کہ:

> The term stresses that element of anything that is resistant to human control, prediction or understanding the unmanaged energy of nature.[1]

اس تعریف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی بن نگار اپنے کسی فن پارے میں ایسے ماحول یا ان کے عناصر کا ذکر کرے کہ جن پر انسانی دست رس نہیں ہے اس کو ماحولیاتی تنقید میں بن نگاری کہا جاتا ہے۔ بن نگاری میں ماحول کے ہر ایک عنصر کی بات کی جاتی ہے۔ سیلاب، زلزلہ، طوفان وغیرہ بھی ماحولیاتی تنقید کی رو سے بن نگاری کے زمرے میں آئیں گے۔

بن نگاری ماحولیاتی تنقید کا ایک اہم نقطہ نظر ہے۔ جس میں ان تمام علاقوں کی بابت بات کی جاتی ہے جو انسان کی خردبرد سے دور آج بھی اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں۔ بن نگاری میں نہ صرف کسی علاقے کی پیش کش کی جاتی ہے بل کہ ہر اس ماحولیاتی عنصر کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے جس پر انسانی تہذیب و ثقافت کے اثرات نہ پڑے ہوں۔ وہ ماحولیاتی عنصر مکمل فطری زندگی گزار رہا ہو۔ اگر وہ کوئی علاقہ ہے تو انسانی تسلط سے مکمل باہر ہو جس پر چاہتے نہ چاہتے انسان اپنا تسلط نہ جما پایا ہو۔

بن نگاری در اصل انسانی تہذیب و ثقافت کے رد عمل کا نام بھی ہے۔ بن نگاری میں ان تمام موجودات کی بابت بات کی جاتی ہے جو انسانی تہذیب کے چنگل سے مکمل طور پر محفوظ ہوں۔ اس ادب میں ان تمام جانوروں کی بابت بات کی جاتی ہے جو سدھائے نہ ہوں بل کہ آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہے ہوں۔ اگر سدھائے ہوئے جانوروں کی پیش کش کی جائے تو اس صورت میں کی جائے کہ اس کے خلاف احتجاج ہو تا کہ ہر جاندار کے حقوق کے تحفظ کی بات کی جائے۔ یہ سب عوامل بن نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔

II نظم میں بن نگاری :

ایک شاعر اپنے گرد و پیش پر باقی تمام لوگوں کی نسبت زیادہ گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کی یہی چیز اسے باقی تمام لوگوں سے منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔ بن نگاری ایک ایسے ہی جہان کی پیش کش ہوتی ہے جس پر انسانی تہذیب و ثقافت کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہوں۔ جب شاعر اس طرح کی تصویر کشی کرتے ہیں تو اس میں فطرت جا بجا جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح سے پیش کش انسان اور اس میں موجود باقی تمام ماحولیاتی عناصر کے لیے فخر کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے

اپنی نظم میں ایسے کئی علاقوں کی بابت لکھا ہے جو انسانی اکھاڑ پچھاڑ سے محفوظ ہیں۔ ان تمام عناصر اور عوامل کو زیر بحث لایا جاتا ہے جن میں فطرت پوری طرح سے آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ آزاد کشمیر کے نامور شاعر منور قریشی کی نظم کھلا دھوکہ ملاحظہ کیجیے :

ننگے ، ٹنڈ منڈ شہتیروں پر

موسم نے برف کے پھول بکھیرے ہیں

ان بھدے ، میلے جسموں کو اُجلی سفید قمیضیں مل گئی ہیں

جن کے کالر اور کف بے داغ ہیں

اور جن کی براق سطحوں پر

اندر بسنے والی تاریکیوں کا کوئی سایہ نہیں

نئی تہوں کے طفیل بے ڈھنگے شہتیر سڈول ہو گئے ہیں

شاید پاکیزہ بھی

اور یقیناً قابل رشک!

اور اُجلی پوشاکوں کی اس بھیڑ کو دیکھنے والے

اپنے پتوں کے بوجھ پر کف افسوس ملتے ہوئے

سبز گردنیں آسمان کی جانب بلند کیے

خود کو گرا دینے کی خواہش کو دبائے ،

کوس رہے ہیں

اپنی آنکھوں پر اپنے ہاتھوں کی پٹیاں باندھ رہے ہیں

سورج بھڑ کیلے لباس والوں کا دوست ہے

تاکہ یہ چکا چوند

یہ خیرگی!

کہیں اُن کی بصارت کو ڈس نہ لے[۲]

منور قریشی کی اس نظم کو پڑھنے کے بعد یہ تاثر پوری طرح سے قائم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے نظم میں بن نگاری کے تمام لوازمات پورے کیے ہیں۔ وائلڈرنس کے بنیادی تصورات کو خوب صورت انداز میں شامل کیا گیا ہے۔ فطرت کا اپنی شکل میں برقرار ہونا شاعر کے مشاہدے اور فطرت کے ساتھ تعلق کی دلیل ہے۔ منور قریشی کی درج بالا جو اسی ترتیب سے چلتی ہے جس میں فطری ماحول کی تصویر کشی ملتی ہے اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے اس نظم میں ایک ایسے ماحول کو موضوع بحث بنایا ہے کہ جس میں انسانی عمل سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ایسے ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے جو شکست و ریخت کے اثرات سے محفوظ محض فطری انداز میں بڑھ رہا ہے سکاٹ رسل لکھتے ہیں:

> فطرت کے بارے میں ہمارے نظریات جس قدر بلند ہیں ہمارا ذاتی تجربہ ہے اتنا ہی کھوکھلا ہے۔ حقیقی فکشن مشترک علمی نعروں سے کہیں زیادہ گہرائی میں رو بہ عمل ہوتا ہے۔۔۔ اگر ہم تصورات میں انقلاب کے متمنی ہیں تو ہمارے عہد کے مصنفین کو سبز دنیا کے مطالعہ کے لیے باہر نکل کر خود کو انسانی حصاریت سے آزاد کروانا ہو گا۔[۳]

سکاٹ رسل کے اس نظریے کی مصداق منور قریشی نے اپنی انسانی بستی سے نکل کر ایسے ماحول کی تلاش کی ہے جس میں صرف اور صرف ماحول اور فطرت کو زیر بحث لایا گیاہے منور قریشی نے خوب صورت انداز میں انسانی با لادستی کے نظریے سے قطع نظر صرف اور صرف ماحولیاتی عناصر کو ہی اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ وہ ماحولیاتی عناصر کے لیے بھی وہی جذبات رکھتے ہیں جو ایک انسان کے لیے رکھتے ہیں۔ اس نظم میں مختلف پودوں کو ایک دوسرے سے حسد کرتے ہوئے بھی

دکھایا گیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ منور قریشی نے فطرت نگاری میں وائلڈرنس کی تمام شرائط کو پورا کر دکھایا ہے۔

شعرنے اس نظم میں ایسے ماحول کی پیش کش کی ہے جس میں برف باری کے باعث پھیلنے والی خوب صورتی کو فطری انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ برف باری کے باعث تمام ماحولیاتی عناصر کا سفید پوشاک پہنے اگلو بننے کے عمل کو بیان کیا گیا۔ اس نظم میں بن نگاری کے حوالے سے کوئی کھوکھلا تجزیہ شامل نہیں کیا گیا بل کہ ماحولیاتی عناصر کو ایک جیتی جاگتی تصویر کے روپ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کی مثال ملنا مشکل ہے المختصر منور قریشی کی نظم کھلا دھوکہ اپنے آپ میں بن نگاری کی شاندار مثال ہے جس میں بن نگاری کے تمام لوازمات کو بطریق احسن نبھایا گیا ہے۔

انسانی ذہن کی وسعت ہی اس کو باقی مخلوقات سے جدا کرتی ہے۔ شاعر کی حساسیت اس کو باقی انسانوں سے منفرد بناتی ہے۔ ایک شاعر اپنی سوچ اور اپنے تخیل کے بل بوتے پر ماحول اور ماحولیاتی عناصر کے ہر ایک احساس اور درد کو محسوس کر کے اس کی تصویر کشی کر سکتا ہے۔ ماحولیاتی عوامل کی یہ تصویر کشی بن نگاری کے ضمن میں آتی ہے۔ منور قریشی کی نظم عزم نو ملاحظہ کریں:

عزم نو

آج پھر ذہن میں ہنگامۂ محشر ہے بپا

پھر مجھے آج کی شب نیند نہیں آئے گی

کتنی مغموم ہے ، بوجھل ہے فضا ، بن تیرے

چشم شب دھیرے سے اب جیسے چھلک جائے گی

خون میں بھیگے ہوئے چیری کے گم سم پتے

سوچتے ہیں کہ ابھی موت اُتر آئے گی

پیڑ سے ٹوٹ کے گرتے ہوئے پتوں کی دھمک

ذہن میں سینکڑوں طوفان اُٹھا جائے گی

چیڑ کے جسم سے لپٹی ہوئی برفاب ردا

میرے احساس کے پیکر سے چمٹ جائے گے

اور اس رات کی تنہائی میں ، خاموشی میں

میرے چہرے سے الجھتی ہے بہت سرد ہوا

نرم سی برف سسکتی ہے میرے پاؤں تلے

نقش ہو جاتے ہیں ہر گام پہ تاریک خلا

سوچتا ہوں کہ یہ ماحول یہ ٹھنڈا ماحول

میرے احساس کی گرمی بھی نگل جائے گا

یونہی جمتی رہی کھیتوں میں اگر برف کی تہہ

برف ہو جائے گی جذبات کی بہتی گنگا

آسماں پھر سے اگل دے گا وہ اُجلی جھالر

اوڑھ لے گی یہ زمیں پھر وہ کفن رنگ قبا

لیکن اس رات کو بھی ، اونگھتے ماحول میں بھی

مجھ تک آتی ہے ابھی تک ترے کوچے کی ہوا

ٹوپیاں برف کی پہنے ہوئے اونچے کہسار

مجھ کو جھک جھک کے دیا کرتے ہیں خاموش صدا

راہ گم کردہ مسافر کی طرح آوارہ

آج بھی دل میں سنبھالے ہوئےیادوں کی چتا

اوڑھ کر پھرتا ہوں ارمانوں کا اک گرم لحاف

ان پہاڑوں پہ ٹھٹھرتی ہوئی راتوں کو سدا

اور اب مجھ کو مرے جلتے چناروں کی قسم

ان سسکتے ہوتے ویران نظاروں کی قسم

ڈوبتی رات کے ٹھٹھرتے ہوئے تاروں کی قسم

منجمد برف میں ملفوف بہاروں کی قسم

توڑ کر برف کی دیوار نکل جاؤں گا[۴]

اس نظم کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں موجود بن نگاری سے متعلق مزید سوالات بھی حل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نظم کی ابتدا میں جس طرح ماحولیاتی عناصر اور عوامل کی تصویر کشی کی ہے اس میں رومان کا جذبہ بھی موجود ہے۔ تا ہم اس کے بعد تمام کی تمام نظم بن نگاری کی منظر کشی پر دلالت کرتی ہے۔ اس نظم میں ایک ایسے خطہ ارضی کی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں شاعر کے علاوہ کوئی دوسرا انسانی کردار شامل نہیں۔

اس نظم میں شاعر نے خوب صورت انداز میں ایک جنگل کی تصویر کشی کی ہے۔ جس میں چیری کے درخت کے سرخ رنگ کو خون کہا گیا ہے۔ اس نظم میں بات کی گئی ہے کہ ہر طرف اتنا سکوت ہے کہ اگر درخت سے کوئی پتا زمین پر گرتا ہے تو اس کی دھمک سے بھی گویا ایک شور پیدا ہوتاہوا سنائی دیتا ہے۔ بن نگاری کا یہ انداز نرالا اور انوکھا ہے۔ جس میں ہر ایک چیز کی منظر کشی کی گئی ہے۔ شاعر نے ماحول کا زیرک نظری سے مشاہدہ کیا ہے۔ ہر بات کو ایسے تحریر کیا گیا ہے جس سے اس ماحول کی تصویر واضح ہو جس کی شاعر وضاحت پیش کرنا چاہتا ہے۔ آگے چل کر شاعر اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ چیڑ کے درخت پر جو برف پڑی ہے وہ میرے پیکر

سے بھی ٹکرا سکتی ہے۔ جس سے میں بھی باقی ماحولیاتی چیزوں میں سے ایک ہو جاؤں گا۔ ہم میں کسی قسم کی کوئی تمیز نہیں رہے گی۔

اگلے حصے میں بتاتے ہیں کہ جب میں برف پر پاؤں رکھتا ہوں تو برف اندر کو دھنسی ہوئی چلی جاتی ہے۔ جس سے میرے پاؤں کے نشانات بنتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس سے میرے اندر ایک فرحت انگیز سرد لہر دوڑنے لگی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے زمین نے کفن اوڑھ لیا ہے۔ وہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ ان تمام ماحولیاتی عناصر کے ہوتے ہوئے میں محو سفر رہتا ہوں۔ آخری حصے میں بھی اس بات کا ذکر کر رہے ہیں کہ میں جلد ہی ان تمام جگہوں سے نکل جاؤں گا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بن نگاری میں ایک ایسے ماحول کی بابت بات کی جاتی ہے جو انسانی آبادی سے دور اور نام نہاد انسانی تہذیب و ثقافت کے چنگل سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ اس نظم میں بھی ایسے ہی ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے جہاں پر انسان کی شکست و ریخت کے اثرات بالکل دکھائی نہیں دیتے۔ انسانی تہذیب و ثقافت دکھائی نہیں دیتی بل کہ ایک فطری ماحول دکھائی دیتا ہے جو آزادی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ جس کے بعد بھی اس نظم میں شاعر نے فطرت کی آواز بن کر بن نگاری کے تمام لوازمات کو بخوبی پورا کیا ہے۔

موسم فطرت کے انھی عوامل میں سے ہیں کہ جن پر انسان اور انسانی تہذیب کسی بھی صورت میں حاوی نہیں ہو سکتی بل کہ یہ تو انسان کو فطرت کی آواز سننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ موسم انسان سمیت اس کرہ ارضی کے ہر ایک ماحولیاتی عنصر کو بلا تخصیص متاثر کرتے ہیں۔ جس کی بازگشت اس کے گزرنے کے بعد بھی سنی جا سکتی ہے۔ موسم فطرت کا ایک ایسا حسین اور وقیع پہلو ہے جس نے دھرتی کے تمام عناصر کو اپنی موجودگی اور عدم موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ فطرت کے باقی پہلوؤں سمیت موسم بھی ایک ایسا پہلو ہی ہے۔ موسم کے بدلتے ہوئے تیور ہر ایک چیز کو اپنی خاصیت کے مطابق بدلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ منور قریشی کی نظم پرانی لکیریں نئی شکلیں اس حوالے سے ایک اور خوب صورت کاوش ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

پرانی لکیریں، نئی شکلیں

ہوائیں پژ مردہ زرد پتوں کی سرد لاشوں پہ سر جھکائے

خزاں کی یورش کو دیکھتی ہیں

اُداس جنگل، پہاڑ، بوٹے

کہ جن کے چہروں پہ شام ڈھلنے سے کچھ ہی پہلے

بھری بہاروں کی رونقیں تھیں

دھوئیں میں روپوش ہوتے سورج کو دیکھتے ہیں

یہیں سے پہلے پہل مہکتی بہاروں کا بیج اگا تھا

یہیں اندھیروں کی کوکھ سے سرخیِ سحر نے جنم لیا تھا

یہیں پر امن اور آشتی کا حسین سورج طلوع ہوا تھا

تھی دوپہر نرم گرم کرنوں میں زندگی کی حرارتیں تھیں

بجا کہ حدت بھی ، آگ بھی تھی

بجا کہ سورج دہک رہا تھا

اداس تیرہ مہیب راتوں سے جلتا سورج مگر بھلا تھا[5]

اس نظم میں شاعر نے خوب صورت انداز میں موسم، ماحولیاتی عوامل اور عناصر کو پیش کیا ہے۔ یہ نظم اپنے آپ میں بن نگاری کی بہترین مثال ہے۔ جس میں ایک فطری ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس نظم میں ایک ایسی جگہ کی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں جنگلوں، پہاڑوں اور درختوں کی اداسی کی بات کی گئی ہے۔ نظم میں خوب صورت انداز میں ماحولیاتی عناصر کی پریشانی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ہواؤں کی بے بسی کا اظہار بھی کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی

چاہیے کہ ماحولیاتی عناصر بالکل ایسے ہی ظاہر ہونے چاہئیں جیسے انسان جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ نظم میں بالکل اسی انداز میں ماحولیاتی عناصر کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شاعر نے اس نظم میں موسم کی تبدیلی کے باعث ہونے والے اثرات کو بیان کیا ہے۔ جس میں مختلف چیزوں کو اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے ہوئے دکھایا گیا ہے یہ نظم جہاں ایسی جگہ کی پیش کش کرتی ہے جو انسان کی شکست و ریخت سے محفوظ ہے وہیں پر اس میں موجود تمام عناصر کے جذبات و احساسات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ منور قریشی کی اس نظم میں ماحولیاتی تنقید کی رو سے وائلڈر نس کی ذیل میں تمام ماحولیاتی تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے۔ جس میں ایک امید کی کرن بھی دکھائی دیتی ہے۔ ۔

صبح کا منظر فطرت کے حسین مناظر میں سے ایک منظر ہے جس کا سحر ہر چیز پر چڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہر چیز بہت زیادہ خوب صورت اور ہر منظر دلکش معلوم ہونے لگتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کی جان میں جان آ جاتی ہے منور قریشی کی نظم پیش گوئی اس حوالے سے ایک اہم نظم ہے۔ جس میں بن نگاری کو خوب صورت طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

پیش گوئی

وہ دور دیکھو

وہ دور دیکھو

افق کے اُس پار اپنی آنکھوں سے شب کی چلمن بنا کے دیکھو

نظر کی شمعیں جلا کے دیکھو

کہ گھور اندھیرے کے سرد اُفق پر

سحر کے آثار جی اُٹھے ہیں

شب الم کی بھی ہوتی برف دھیرے دھیرے پگھل رہی ہے

کرن کی قندیل جل رہی ہے

زمین سورج اُگل رہی ہے

افق کی جانب نگاہ پھیرو

وہ دور کوہسار کی جبیں پر

ابھرتے سورج کی شوخ کرنیں دمک رہی ہیں

بلند قامت حسین چیڑوں نے

اپنے شانوں پہ جلتا سورج اٹھا لیا ہے

وہ دور وادی میں شب کا عفریت

دھیرے دھیرے سمٹ رہا ہے

سنو کہ کوئی پکارتا ہے کوئی پکارتا ہے

سنو سحر خیز کوئی جینے کی رہ سجاتا گزر رہا ہے[۶]

درج بالا نظم میں صبح کے خوب صورت مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں شاعر طلوع سحر کی بات کرتے ہیں۔ نظم میں شاعر نے یہ ایک ایسے فطری ماحول کی پیش کش کی ہے جو انسانی شکست و ریخت سے پاک ہے۔ انسانی تہذیب و ثقافت سے دور ہے ایسا کرہ ارض میں شامل کیا گیا ہے جو انسان سے پاک ہے۔ شاعر اس نظم میں لکھتے ہیں کہ افق کے اس پار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سحر کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں۔ سفید برف پر پڑنے والی سورج کی کرنیں جب پلٹ کر آتی ہیں تو خوب صورت نظارہ دیتی ہیں۔ جب سورج کی کرنیں چیڑ کے اونچے درختوں کے شانوں پر پڑتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے اپنے کاندھوں پر سورج اٹھا لیا ہو یعنی وہ اس قدر چمک چمک دار معلوم ہوتی ہیں۔

رات کی کالی گھٹا ختم ہونے والی ہے اور آہستہ آہستہ دن کا اجالا ہر طرف سے آنے لگا ہے۔ یہ نظم ایک ایسی جگہ کے بارے میں ہے جہاں پر انسان کا کوئی بھی کردار نظر نہیں آتا۔ جس میں

انسان نامی چیز کو فطرت کا حسن بگاڑتے ہوئے نہیں دیکھا جا سکتا۔ نظم میں صرف اور صرف فطری عوامل کی بالادستی دکھائی دیتی ہے۔ بن نگاری کا بنیادی موقف یہی ہے۔ٹموتھی کلارک لکھتی ہیں:

> The term wild has emerged in environmental criticism as a distinctive aesthetic/ ecological and moral category---The term stresses that element of anything that is resistant to human control, prediction or understanding, 'the unmanaged energy of nature' manifest in even the densest cities in weeds that push through small cracks in the pavement or fissures in a wall.[۷]

ٹموتھی کلارک کی اس تعریف کی رو سے منور قریشی کی یہ نظم ایک بھرپور ادبی کاوش معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ماحولیاتی عناصر کو بغیر تبدیلی کے پیش کیا گیا ہے اس میں انسانی کردار شامل ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منور قریشی کی یہ نظم ماحولیاتی تنقید اور بالخصوص بن نگاری میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس انداز میں ماحول عکاسی شعرا کے ہاں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ تا ہم منور قریشی کی شاعری میں یہ انداز بارہا اپنایا گیا ہے۔

یہ جہان اپنے اندر کئی خوبیاں رکھتا ہے۔ ان خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جگہ جگہ پر فطرت اپنے رنگ جمائے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ فطرت کی یہ رنگا رنگی انسان کو کافی بھاتی ہے لیکن انسان کی حرکات سے یہ کرہ ارضی کافی متاثر ہو رہا ہے۔ اس پر موجود فطرت کے رنگ ہر چیز کو بہت زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ یہ اپنے اندر محبت ہی محبت رکھتی ہے۔ شفیق راجا کی نظم پیار بن نگاری کے ضمن میں ایک اہم اضافہ ہے نظم پیار ملاحظہ کیجیے:

پیار

اپنی دھرتی کے سینے پہ اگتے ہوئے

ہم نے ہر پیڑ پر اس کی ہر شاخ پر

ہم نے ہر شاخ پر اس کے ہر پھول پر

اس کی خوشبو میں اور اس کے ہر رنگ میں

پیار ہی پیار دیکھا ہے کھلتے ہوئے

پیار ہی پھول ہے پیار ہی رنگ ہے

پیار خوشبو ہے اور پیار باد صبا

ہم نے دیکھا ہے لوگوں کو اکثر یہاں

پیار ہوتے ہوئے پیار پاتے ہوئے

پیار پاتے ہوئے، خار چنتے ہوئے

خار چنتے ہوئے، زخم کھاتے ہوئے

پیار کے گیت سب کو سناتے ہوئے

ہم نے دیکھا ہے لوگوں کو اکثر یہاں

زخم کھاتے ہوئے، مسکراتے ہوئے

مسکراتے ہوئے اشک پیتے ہوئے

اشک پیتے ہوئے گنگناتے ہوئے [۸]

اس نظم میں شاعر نے ارض کے بطن سے پھوٹنے والی ہر چیز کو محبت کا اشارہ قرار دیا ہے۔ شفیق راجا کی نظم میں ایک ایسے علاقے کا ذکر ملتا ہے جس میں انسانی شخصیت بھی موجود نہیں ہے۔ یہ نظم در اصل انسانی تہذیب و ثقافت کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے۔ جو فطرت کے تمام پہلوؤں کو بیان کرتی ہیں۔ ان تمام فطری چیزوں کو محبت کا علم بردار قرار دیا ہے۔ در اصل شاعر یہ بات ثابت

کرنا چاہتے ہیں کہ فطرت محبت ہی محبت ہے جو بغیر لالچ اور حرص کے ہر ایک سے محبت کرتی ہے۔ فضا میں پھیلی ہوئی خوش بو کا کسی بھی چیز سے کوئی جھگڑا نہیں۔ برستی بارش، بادل، ہوا، چاند، ستارے، پھول، پرندے، پہاڑ، دریا اور روشنی کسی بھی ماحولیاتی میں محبت کے سوا کچھ نہیں۔

اس زمین پر رہنے والے لوگ جو اس زعم میں مبتلا ہیں کہ یہ وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ ان کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ کوئی بھی کام سرانجام دینے کے لیے صرف اور صرف اپنا فائدہ اور نقصان سوچتے ہیں۔ بن نگاری میں جہاں انسانی خرد برد سے پاک کرہ ارضی کی بات کی جاتی ہے وہیں پر انسانی بالادستی کو بھی رد کیا جاتا ہے۔ یہ نظم فطرت اور فطری عناصر کی فیاضی کو بیان کر کے انسانی ذہن میں موجود با لاتر ہونے کے زعم کے خلاف مزاحمت بھی کرتی ہے۔

بن نگاری بعض اوقات انسانی کردار کو بھی اپنے اندر جگہ دیتی ہے۔ مگر یہ سب اس وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب یہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی بجائے ماحولیاتی عناصر کے روپ میں بالکل ویسے ہی ظاہر ہو جیسے باقی ماحولیاتی عناصر کسی فن پارے میں شامل ہوتے ہیں۔ یعنی کوئی بھی کسی دوسرے پر برتری نہیں رکھتا بل کہ تمام کے تمام دھرتی کے بطن سے پھوٹے ہوئے ہیں۔ آزاد کشمیر کے اردو شعرا نے اپنی شاعری میں بھی ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں شفیق راجا کی نظم ایک نظم قابل ذکر ہے نظم ملاحظہ کریں

ایک نظم

میں آیا ہوں تمھیں ملنے

مگر تنہا نہیں آیا

میں اپنے ساتھ لایا ہوں

پہاڑوں سے اترتے ندیوں ، نالوں

حسیں جھرنوں اور ان کی دل ربا یادوں

محبت کی امیں، پھولوں بھری وادی

چناروں، برف زاروں ، مرغزاروں

کو ہساروں کے سندیسے بھی

میں اپنے ساتھ لایا ہوں

یہی پیغام لایا ہوں

کہ وہ اب تک تمہاری راہ تکتے ہیں

مگر لگتا ہے ان کی آس کو تم توڑ ڈالو گے [۹]

یہ نظم ماحولیاتی عناصر کے گرد گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔تاہم اس میں انسانی کردار بھی جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کردار اتنا موہوم ہے کہ اس میں انسان کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ شاعر ایسے فطری ماحول کی بابت بات کر رہے ہیں جس میں انسانی تہذیب و ثقافت نہیں ہے۔ جو انسانی کردار موجود ہیں وہ بھی اس طرح پیش کیے گئے ہیں جس طرح باقی ماحولیاتی عناصر پیش کیے گئے ہیں۔ انسان کو اشرف المخلوقات کے طور پر شامل نہیں کیا گیا۔

اس نظم میں شفیق راجا نے ماحولیاتی عوامل کا ذکر کیا ہے جو ان کی شاعری میں انسانوں کی طرح ہیں جذبات و احساسات کے حامل ہیں۔ جو کسی کا ویسے ہی انتظار کرتے ہیں جیسے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا انتظار کرتا ہے۔ ندی، نالوں، جھیلوں، جھرنوں اور وادیوں کی بات کی گئی ہے جو کسی کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ماحولیات سے متعلق ہونے والی کانفرنس میں موجود ماحولیات کے لیے پیش کیے گئے قوانین میں سے ایک درج ذیل ہے:

> Environmental justice demands that public policy be based on mutual respect and justice for all peoples, free from any form of discrimination or bias.[۱۰]

اس قانون کے مطابق تمام ماحولیاتی عناصر کو کھل کر آزادی سے جینے کا حق حاصل ہے۔ ہر چیز اپنی فطرت کے مطابق آزاد ہے۔ اسے جو آزادی فطرت نے عطا کی ہے اس کی آزادی ہر حال میں برقرار رہنی چاہیے۔ اس کی آزادی پر قدغن لگانا ماحولیاتی عناصر میں سے چند ایک کو یا کسی ایک نوع کو کم تر سمجھنا غیر فطری عمل ہے۔ جس کی روک تھام بہرحال ضروری ہے۔ نظم احساس بہار ملاحظہ کیجیے:

احساس بہار

وہ بلبل جو خزاں رت میں

مرے گھر کے قریب اک پیڑ کی ٹہنی پہ تنہا بیٹھ کر مجھ کو اور

ملال ویاس کے نغمے سناتا تھا

خوشی سے آج پاگل ہو رہا ہے

صبح سے کیف و مسرت کے ترانے گا رہا ہے

اور

مرے بر آمدے میں بار بار آکر مجھے

اکسا رہا ہے

اپنے بستر سے اُٹھو

کمرے سے باہر کا سماں دیکھو

بہار آئی ہے

دیکھو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے

گل ولالہ سے دھرتی سج گئی ہے

اور

پرندے چہچہاتے ، گیت گاتے ، جشن کرتے پھر رہے ہیں

آسماں قوس قزح کے سات رنگوں اور پتنگوں سے مزین ہے

نظارہ کرنے والوں کے لیے ہر سمت جنت ہے

مگر وہ بلبل سادہ یہ کیا جانے

کہ جب تک وہ گلابی رو

سپید و سرخ میں ملبوس وہ پیکر

وہ میری ہم سخن ، ہم روح ، جان جاں

نہ میرے رُو بہ رو ہو گی

مرا یہ دل کہ جس پر

اس سمے پژمردگی کے گہرے سائے ہیں

اسے احساس فصل گل نہیں ہو گا "

اس نظم کا شف رفیق نے ایک پرندے کا ذکر کیا ہے جو بہرحال کاشف رفیق کی نظم ایک کردار کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے جو مختلف موسموں میں مختلف طرح کے گیت گاتا ہے۔ خزاں کے موسم میں وہ بلبل گلاب کے گیت سناتا جب کہ بہار کے موسم میں وہی پرندہ خوشی کے نغمے سناتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انسان اور پرندے کو ایک ساتھ دکھایا ہے ۔ یہ دونوں برابری کی سطح پر رکھے گئے ہیں۔ کسی ایک ماحولیاتی عنصر کو کسی دوسرے ماحولیاتی عنصر پر فوقیت نہیں دی گئی اس لیے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ یہ نظم بن نگاری کی ذیل میں ہے۔ اس نظم میں بن نگاری کے ان تمام لوازمات کو مدنظر رکھا گیا جو ایک وائلڈرنس رائٹنگ کے شاہ کار کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس نظم میں جس پرندے کا ذکر کیا وہ کسی بھی طور سدھایا ہوا نہیں ہے بل کہ وہ پرندہ ایک آزاد پنچھی ہے جو فطرت

سے متاثر ہے۔ جو فطرت سے خوش ہو کر خوشی کے گیت گاتا ہے جب فطرت اس کے برعکس ہو تو وہ غم اور رنج کا اظہار کرتا ہے۔ جب کسی ایسے جاندار اور پرندے کو تحریر میں لایا جائے تو اسے بھی ماحولیاتی تنقید میں بن نگاری کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ گریگ گیئرڈ لکھتے ہیں:

> Liberationist criticism typically attempts to undermine the moral and legal distinctions between humans and animals, but it takes for granted the difference between wild and domestic animals. We are rarely enjoined to prevent the suffering of wild animals because our moral responsibility principally applies to the animals we use for food, transport and companionship. Ecocritics also rely on the distinction, but tend to venerate wild animals while treating cattle, sheep and cats as the destructive accomplices of human culture.[۱۲]

کاشف رفیق نے اس نظم میں بہار کی آمد کے بعد پرندوں میں آ جانے والے جذبے کو بیان کیا ہے جو ان میں موجود تھے۔ جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام پرندے جو بہار کے آنے پر خوشی اور مسرت کے ساتھ جی رہے ہیں وہ کسی کے ستائے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کا بہار کے لیے خوش ہونا اور خزاں کے لیے پریشان ہونا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ یہ ہر دو صورتوں میں فطرت سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے پرندے جو پنجروں میں بند ہوتے ہیں ان پر موسمی تغیرات کے اثرات نہیں پڑتے۔ ان کو کھانے کے لیے محنت نہیں کرنا پڑتی۔ رہنے کے لیے گھونسلہ نہیں بنانا پڑتا۔ بارش، دھوپ، سردی اور گرمی سے حفاظت نہیں کرنی پڑتی۔ اس لیے ان پر موسمی اثرات نہیں ہوتے۔ اس نظم میں انسان کو بھی پرندوں کے ساتھ کا ہی ایک عنصر قرار دیا گیا ہے جو بن نگاری کی ذیل میں ہے۔ گویا کاشف رفیق کی یہ نظم بشر مرکزیت کے خلاف نہیں تو اس کے حق میں بھی نہیں بل کہ یہ ایک ایسے فطری ماحول کی تصویر کشی ہے جو بن نگاری کی ذیل میں ہے۔

بن نگاری میں کسی ایسی جگہ کی پیش کش کی جاتی ہے جس میں انسانی آبادی نہ ہو ضروری نہیں کہ یہ کسی جنگل کے بارے میں ہو وہ کسی صحرا، پہاڑ، دریا غیرہ کے بارے میں بھی ہو سکتی ہے ایسی نظمیں بھی مل جاتی ہیں جو کسی صحرا کی پیش کش ہوا کرتی ہیں۔ صحراؤں کی پیش کش کو بن نگاری میں خاص مقام حاصل ہے۔ اگرچہ کشمیر ایک ایسا علاقہ ہے جہاں پر صحرا نہیں ہے مگر اردو شاعری کی روایت میں صحرا کو خاص مقام حاصل ہے شعرا صحرا کے موضوع کو کثرت کے ساتھ برتتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کاشف رفیق کی نظم بے سایہ پیڑ ملاحظہ کیجیے:

بے سایہ پیڑ

روز اُڑا دے نیند

تلخی بھرا اک خواب

خواب کے پردے پر

روز یہ فلم چلے

ایک لق و دق دشت

اُس پر کڑکتی دھوپ

بار گراں بر دوش

اک ننھی سی جان

تشنہ ، تھکن سے چور

اور فقط اُمید

اک بے سایہ پیڑ [۱۳]

اس نظم میں ایک صحرا کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جس میں انسانی تہذیب و ثقافت کا کوئی دخل نہیں۔ بل کہ جہاں پر کوئی بھی چیز نظر نہیں آرہی تاحد نظر صرف اور صرف ایک صحرا دکھائی دیتا ہے جس میں صرف اور صرف ایک پیڑ دکھائی دے رہا ہے وہ بھی ایک ایسا پیڑہے جس کا کوئی سایہ نہیں ایڈورڈ ڈابے لکھتے ہیں:

> Here you will see the rushes and willowsand cottonwoods, and four-winged dragonflies in green, blue, scarlet and gold, and schools of minnows in the water, moving from sunlight to shadow and back again. [۱۴]

یعنی اس صحرا میں موجود ان تمام موجودات کا ذکر جو صحرا میں موجود ہوتے ہیں بن نگاری کی ذیل میں ہی آتا ہے۔ان جگہوں پر انسانی تسلط کے آثار بھی نہیں ہونے چاہییں۔ اس منظر میں موجود ایک پیڑ دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے آثار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دراصل یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے ایک خواب دیکھا۔ جب کہ دوسرے حصے میں ایک ایسے منظر کی عکاسی کی گئی ہے جو انسانی خوردبرد سے پاک ہے۔ یعنی وہ ایک صحرا ہے جس میں کہیں کہیں کوئی پیڑ دکھائی دیتا ہے۔ شاعر نے ماحول کی نہایت عمدگی کے ساتھ عکاسی کی ہے جس میں ایک ایسا پیڑ ہے جو خود بے سایہ ہے جو کسی کو سایہ نہیں دے سکتا۔ دراصل صحرا کے پودے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ جو کسی کو بھی سایہ نہیں دے سکتے جو کہ صحرا کی جگہ صرف اور صرف وہاں رہنے والے جانداروں کے لیے مناسب ہے۔ باقی کسی بھی طرح کے جانداروں کی بقا ممکن نہیں۔ کاشف رفیق کی نظم نگاری کی ذیل میں اہم نظم ہے۔

اگرچہ انسان کی کوشش رہی ہے کہ یہ فطرت کو اپنے قابو میں کر لے اور اس کو اپنے حکم کے تابع کرلے۔ مگر اس کی تمام تر کوشش کے باوجود ایسا ہونا ممکن نہیں ہو سکا۔ انسان نے دریاوں کے رخ بدلے، بارشوں کو متعین کردہ مقام اور تاریخ سے بدل کر برسا دیا، سمندر پر جزیرے بنا لیے مگر ان سب کوششوں کے باوجود فطرت سر اٹھاتی ہے تو انسان کی تمام کی تمام محنت رائیگاں چلی جاتی

ہے۔ فطرت دراصل ہر بدلتے ہوئے لمحے کے ساتھ بدلنے والے رویے کا نام ہے جس کو وقتی ٹالا جا سکتا ہے مگر اس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ ہر بار کہیں نہ کہیں سے خود کو ظاہر کر دیتی ہے۔ فطرت زندگی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے کبھی یہ کسی پیڑ پودے کی صورت میں کسی پتھر سے نمودار ہوتی ہے تو کہیں یہ زندگی پختہ دیوروں کو چیر کر ظاہر ہوتی ہے۔

انسان اگر درخت لگاتا ہے تو وہاں پر پرندے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح فطرت بھی زندگی کی صورت میں رقص کرنے لگتی ہے۔ الغرض انسان جتنی محنت کرے وہ فطرت کو مٹا نہیں سکتا بل کہ فطرت مزید قوت کے ساتھ سامنے آتی ہے اور انسان کو نقصان پہنچاتی ہے۔ لہذا فطرت ہمیشہ انسان پر غالب رہی اور ہمیشہ ہی انسان پر غالب رہے گی انسان کا فطرت پر حملہ آور ہونا انسان کے حق میں درست نہیں کیوں کہاگر فطرت صحیح ہے تو انسان بھی ٹھیک رہے گا۔ فطرت کا تباہ ہونا گویا تمام جانداروں کی زندگیوں کے لیے خطرہ ہے تاہم بن نگاری ان تمام چیزوں کو بھی زیر بحث لاتی جن میں فطرت ایک بستی میں پوری قوت اور شدت کے ساتھ موجود ہے۔ ذیل میں واحد اعجاز میر کی نظم پیش کی جاتی ہے ملاحظہ ہو

جنگل کے قریب آبادیوں اور علاقوں میں

جنگل کی رٹ زیادہ مضبوط ہے

شیر چیتے دندناتے رہتے ہیں

کتے بھونکتے رہتے ہیں

ریچھ محصول وصول کرنے کھیتوں میں آ گھستے ہیں

برف باری ہو جاتی ہے تو دے سرک جاتے ہیں

راستے مسدود ہو جاتے ہیں

کھانا اور پانی ڈھونڈنا پڑتا ہے

با خبر علاقوں تک خبر پہنچنے تک موسم تبدیل ہو جاتا ہے

کسی ادارے کی ضرورت ہی نہیں رہتی

زندگی خوب صورت ہے[۱۵]

یہ نظم دراصل انسان کی فطرت پر حملہ آوری کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ جس میں شاعر نے خوب صورت انداز میں فطرت کی بالادستی کی بات کی ہے۔ فطرت بہرحال انسان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ جس کو دوام حاصل ہے۔ اس نظم میں شاعر واحداعجازمیر نے بن نگاری کی ذیل میں فطرت کی عظمت اور وقار کی آسان الفاظ میں عکاسی کی ہے۔انسان جتنا مرضی چاہے مضبوط ہو اسے بہرحال فطرت کے تابع رہنا پڑتا ہے۔ فطرت اس کی تابع فرمان نہیں ہو سکتی۔ شاعر واحد اعجازمیر نے انسان اور باقی ماحولیاتی عناصر کو مادی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان فطرت پر حملہ آور ہوا ہے لیکن اس کے باوجود باقی فطرت عناصر نے اس کی رٹ تسلیم نہیں کی۔ باقی جانداروں کا انسانی بستیوں سے غذائی اجناس کا لے جانا بہرحال فطرت کی جیت اور نام نہاد انسانی بالادستی کے خلاف ثبوت ہے۔ اس نظم میں شاعر واحد اعجاز میر نے فطرت اور فطری زندگی کو ناقابل شکست قرار دیا ہے۔

در اصل نظم میں انسانی بالادستی کے خلاف موجود احتجاج بن نگاری کی ذیل میں آتا ہے۔ جسے کوئی بھی دوسری مخلوق تسلیم نہیں کرتی۔ انسان کے بنائے ہوئے نام نہاد قوانین صرف انسان پر لاگو کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی بھی دوسری مخلوق ان قوانین کی پاسداری کی پابند نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر نے اس موضوع کو اپنی نظم پیش کیا۔ انسان قوانین بنا سکتا ہے مگر وہ باقی مخلوقات پر ان قوانین کو لاگو نہیں کر سکتا۔ دراصل یہ نظم انسان کے توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے جس کو بن نگاری میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی تسلسل میں آزاد کشمیر کے ایک اور شاعر ایم یامین کی نظم قیدی ملاحظہ کیجیے:

قیدی

پھول تھے اور قہر خوش بو کا

خوف کے گھنگھرو چھن سے بجنے لگے

چاندنی کو فروغ تھا اتنا

رات بھر اس طلسم کا فتنہ

سر اٹھاتا رہا مرے اندر

سحر میں قید ۔ آرزو میں گم

سب کے سب ہم

سب کے سب تم

جان جوکھوں میں ڈال کر نکلے

اک کشادہ مکان کی چھت پر

نرگسی چہرے بال کھولے ہوئے

ماتمی سر میں گیت گاتے ہوئے

اپنا تو دل ہی کانپ جاتا ہے

اس گلی میں ہے بیل پھولوں کی

جس کی خوش بُو پر سانپ آتا ہے [۱۶]

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ بن نگاری انسان کی نام نہاد عظمت اور بالادستی کے خلاف رد عمل کا نام ہے۔ اس میں انسانی تہذیب کے مقابلے میں فطرت کی قدرتی نشونما کی بالادستی کی بات کی گئی ہے۔ایم یامین آزاد کشمیر میں نظم کے چنیدہ لوگوں میں سے ایک ہیں جن کی نظم میں فطرت اور اس کے اثرات کا اظہار ملتا ہے۔ ایم یامین کی اس نظم میں انھوں نے انسانی بالادستی کے خلاف بات کی ہے۔اگرچہ نظم میں ظاہری طور پر تو ایسا کچھ نہیں ہے تاہم شہری بستی میں موجود پھولوں کی بیل پر

آنے والا سانپ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شاعر ایم یامین فطرت کے سامنے انسان کو مجبور اور بے بس سمجھتے ہیں ۔ فطرت کبھی کسی کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتی وہ سارے ماحولیاتی عناصر کو برابری کی سطح پر دیکھتی ہے۔ فطرت ایک ماں کی طرح ہے جس کے لیے اس سارے بچے برابری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بعض اوقات ناراضی کا اظہار بھی کرتی ہے اور بعض اوقات محبت بھی کرتی ہے۔

انسانی ذہن میں اشرف المخلوقات ہونے کا فتور اس سے باقی جانداروں پر ظلم ڈھانے کا سبب بنتا ہے۔ جدید دور کا انسان اس بات پر بہت زیادہ اتراتا ہے کہ وہ باقی تمام مخلوقات سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کی ساری ترقی اس کی نسل در نسل علم کی منتقلی کے باعث ممکن ہوئی ہے۔ لیکن انسان کا زعم فطرت وقتاً فوقتاً دور کرتی رہتی ہے۔ انسان بھی فطرت ہی کا ایک جزو ہے جس کو ہم فطرت کا ایک عنصر کہہ سکتے ہیں۔ فطرت دراصل خودرو ہے جسے کسی کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہر ایک چیز کو فطرت کی ضرورت پڑتی ہے۔ واحد اعجاز میر کی نظم ملاحظہ کیجیے:

جنگل جنگل بستی بستی

ہنستے کھیلتے پھولوں کی آوازیں کون سنے

جو کہتے ہیں

محنت کے بل بوتے پر نہیں ہم خودرو ہیں

ہم پھوٹ نکلتے ہیں

بارش کے پہلے بوسے پر کھلتے ہیں

ہم آوارہ لوگوں کو ملتے ہیں

گول مٹول ننھے منے پھول بخار سے تپ رہے تھے

گلابوں کے رخسار دھک رہے تھے

کانوں کی لوئیں سلگ رہی تھیں

سبز پتیاں دو گھونٹ پانی کی دعا مانگتے مانگتے سیاہ پڑ گئیں

حبس بے جا میں خوشبوؤں کا دم گھٹنے لگا

دور دراز کے گرم سمندروں سے آئے ہوئے ہوا کے بوجھل قافلے

چیڑ کے جنگلوں کے گلے لگ گئے

آہیں بلند ہوئیں

درختوں کی آنکھیں بھیگیں

بادل پھوٹ پھوٹ کر روئے

بوندا باندی ہونے لگی...

پرندے بارش سے کچھ دیر قبل کی نا اُمیدی اور جھنجھلاہٹ یاد کر کے ہنس پڑے[۱۷]

نظم کے اس حصے میں شاعر واحد اعجاز میر نے اس نظم میں نہایت عمدگی کے ساتھ بن نگاری کے نظریے کو بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق جنگلوں میں موجود ہنستے کھیلتے خود رو پودے اور پھول یہ کہ رہے ہوتے ہیں کہ ہم خود رو ہیں ہمیں کسی نے پروان نہیں چڑھایا۔ بل کہ ہم اپنی فطرت اور طاقت کے باعث نمودار ہوئے ہیں۔ ہم پر کسی کا احسان نہیں ہے ہم کسی کے احسان مند نہیں ہیں در اصل فطرت احسان کرتی ہے کسی سے احسان نہیں لیتی۔ شاعر واحد اعجاز میر نے کمال عمدگی کے ساتھ انسانی برتری سوچ پر چوٹ کی ہے۔ شاعر ہمارے سامنے ہماری حیثیت اور حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ نظم میں موجود خودرو کا تصور دراصل ہمارے کرہ ارض پر موجود انسانی تسلط کا رد عمل ہے۔ جس میں شاعر مکمل طور پر فطرت کی طرف کھڑے دکھائی دے رہے ہیں۔ شاعر واحد اعجاز میر نے انسانی زعم کی دھجیاں اڑانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی بل کہ ہر طرح سے انسان غرور و تکبر کی نفی کی ہے۔ بن نگاری دراصل یہی ہے جس میں ایک پل میں کوئی چیز موجود ہوتی ہے تو اگلے ہی لمحے وہ چیز منتقل

ہوجاتی ہے۔ فطرت کی یہ آنکھ مچولی تغیر کو جنم دیتی ہے جس سے کار رہِ حیات میں ہر وقت کوئی نہ کوئی تبدیلی وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔ شاعر واحد اعجاز میر نے اس نظم میں ہنر مندی کے ساتھ بن نگاری کے موضوع کو برتا ہے۔ جس میں زندگی خود رو ہے جسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔ کرہ ارضی پر موجود ہر شے چاہے وہ جمادات میں سے ہو یا نباتات میں سے یا پھر حیوانات میں سے ہو اس کو ہر حال میں تراوت یعنی پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس کی یہ ضرورت بہرحال زمین کی ضرورت ہے۔ نباتات و حیوانات کو پانی کی ضرورت جمادات سے زیادہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ پانی کی کمی اور زیادتی کے اثرات جمادات کی نسبت حیوانات اور نباتات سے ظاہر ہوتے ہیں ۔جب بارشیں نہیں ہوتیں تو پھول مرجھانے لگتے ہیں۔ کلیاں کمزور پڑنے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا کی نظر اس طرف بھی ہے شاعر واحد اعجاز میر کی نظم ملاحظہ کریں:

فطرت کسی بھی وقت مہربان ہو سکتی ہے۔

سلگتی ہوئی سہ پہر بارش کے کنوارے قطروں سے نہال بھی ہو سکتی ہے

ہوا سے دُور تو کچھ بھی نہیں ہے

ابھی دو چار بادل آئیں گے

سب کچھ بدل دیں گے

زمیں سیراب ہو جائے گی

بادل کھل کے برسیں گے

ہوا کے ہاتھ میں سب کچھ نہیں ہے

ہوا تو خود کسی کے ہاتھ میں ہے

محبت سے نہیں خالی کوئی ہاتھ

محبت ہر کسی کے ہاتھ میں ہے[۱۸]

شاعر واحد عجاز میر کی نظم میں فطرت کے لیے اتنی حساسیت اور محبت موجود ہے کہ جتنی ایک صاحب شعور انسان کے اندر ہونی چاہیے۔ بن نگاری کا یہ عنصر اگرچہ شاعر قصداً نہیں لا رہے تاہم فطرت کے لیے دل میں موجود محبت اس بات پر مہر ثبت کر دیتی ہے کہ شاعر نے نہ صرف اپنے غم بل کہ گردوپیش میں موجود ہر چیز کے غم کو نظم کیا ہے۔ فطرت کے نوحے میں شاعرواحد اعجاز میر پیش پیش رہے ہیں ان کی درج بالا نظم بقیہ نظموں کی طرح فطری عوامل کی آواز ہی ہے۔ جس میں بن نگاری کے نظریے کے مطابق ایک ایسے کرہ ارضی کا انتخاب کیا گیا ہے جو انسانی دست رس باہر انسانی سائے سے بھی محفوظ ہے ۔جس میں ماحولیاتی عوامل میں برابری کی سطح پر رہ رہے ہیں کسی پر کسی دوسرے کو کوئی فوقیت حاصل نہیں۔

واحد اعجاز میر کی بن نگاری کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ ان کے قلم سے اگرچہ فطرت کے حق میں اور اس کی شکست و ریخت کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے تاہم وہ زیادہ تر باتیں فطرتی عناصر سے کرواتے ہیں۔ جس سے ان کی شاعری کی تاثیر بڑھنے لگتی ہے ان کی بات واضح اور مدلل ہو جاتی ہےَ۔ واحد اعجازمیر کا یہ انداز انھیں فطرت کے محافظ شعرا کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس نظم میں شاعر واحد اعجاز میر نے بارش نہ ہونے کے سبب ننھے پھولوں کو بخار ہونے کی شکایت کی ہے۔ ان کے نزدیک گلابوں کے رخسار سرخ ہو گئے تھے ٹہنیاں دو گھونٹ پانی کے لیے ترس کر دعائیں مانگتے مانگتے سیاہ ہو چکی تھیں۔ خوشبوئیں بھی حبس بے جا میں تھیں

المختصر ہر طرف گرمی کی شدت سے تمام نباتات مرجھائے ہوئے تھے دوسرے حصے میں بارش کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ جس میں تمام نباتات اور ماحولیاتی عوامل کو خوش و خرم دکھایا گیا ہے۔ پرندے وہ باتیں اور مایوسی یاد کر کے ہنس پڑے جو بارش سے پہلے ان میں موجود تھی۔ یہ نظم بن نگاری کی ذیل میں ایک اہم اضافے کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔جس میں انسانی دسترس سے باہر کے ماحول کی تصویر کشی پیش کی گئی ہے۔ جو بن نگاری کا ایک اہم ترین جزو ہے۔ فطرت کا نوحہ کرتے ہوئے کبھی کبھی غم کے ساتھ غصہ بھی شعرا کے قلم کی نوک تک آ جاتا ہے کیوں کہ فطرت پسند شعرا یہ بالکل پسند کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بل کہ وہ ہر ایسی طاقت کی مخالفت کرتے ہیں جو فطرت پر حملہ آور ہوتی ہے۔ واحد اعجاز میر کی نظم ملاحظہ کریں:

دل کرتا ہے شور مچاؤں چیخیں ماروں

اتنے زور سے دھاڑوں

آدم زاد ڈریں سب واپس بھاگیں

تیرے کنارے بیٹھ کے تیرے دکھ میں اتنا روؤں

اتنے اشک بہاؤں

یاں ترے پہلو میں اپنی آنکھ برابر آنسو جھیل بناؤں

تجھ تک آنے والے رستوں میں دیوار اٹھا دوں

تنہائی لٹاؤں

تیری سانس میں زہر نہ پھیلے

تجھے نہ ہو سرطان

تو اپنی تنہائی کے پردے میں عریاں ہو

پریاں واپس آئیں

خواب میں دیکھا پھول ترے سینے سے پھوٹے

دن روشن ہو جائے

جادوگر کی قید سے نکلے شہزادی

شہزادہ دور سے آئے

خواب امر ہو جائے

ہنسی خوشی رہنے لگ جائیں سارے اچھے لوگ

سب اچھا ہو جائے

آتے جاتے خوش آواز پرندوں کو

خوف نہ کوئی خطرہ ہو آبادی سے

وادی وادی پھول کھلیں آزادی سے

تصویروں میں دھواں نہ ہو ہر منظر تازہ ہو

اور سب کچھ سادہ ہو

اطمینان کا لمحہ پائے ایلیٹ

ورڈز ورتھ کی قبر کشادہ ہو[19]

یہ نظم تو گویا بن نگاری کے حق میں اور بشر مرکزیت کے خلاف صحیح معنوں میں احتجاج ہے۔ اس نظم کے الفاظ ہی انسان کو چونکا دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی عفریت کسی چیز کو بچانے کی خاطر لوگوں پر چیختی اور چنگھاڑتی ہے۔ بالکل اسی طرح شاعر واحد اعجاز میر لوگوں پر چلاتے اور غصہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ شاعر کسی انفرادی وجہ سے کسی سے ناراض نہیں ہیں بل کہ وہ فطرت کو بچانے کے لیے ہیں باقی چیزوں اور بالخصوص انسانوں سے متنفر نظر آتے ہیں۔ آخر پر دو ایسے شعرا کا ذکر بھی کیا ہے جو درحقیقت فطرت کے شاعر اور فطرت کے وارث معلوم ہوتے تھے۔ ورڈزورتھ اور ایلیٹ تو نوع انسانی میں باقی تمام لوگوں سے منفرد اور ممتاز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ان دونوں حضرات کو بھی نظم میں شامل کر دیتے ہیں۔ شاعر اس نظم میں دراصل فطرت کی ترجمانی کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ایک ایسا انداز اپنا دو کہ جس کے بعد تمام کے تمام لوگ ان سیاحتی اور خوب صورت مقامات سے دور ہو جائیں تاکہ فطرت دوبارہ سے ان علاقوں میں اپنے رنگ ظاہر کر سکےَ۔

فطرت دوبارہ سے اپنی آب و تاب کو دکھا سکے۔ پھر سے پھول کھلنے لگیں۔ لوگ جن پھولوں کو توڑ کر ساتھ لے جاتے ہیں ان تمام جگہوں پر فطری انداز میں پھول کھلنے لگیں فطرت کو ایک قید

شہزادی قرار دیا ہے کہ جب فطرت فطری شکل میں واپس آئے تو وہ قید شہزادی قید سے نکل جائے۔وہ تمام جگہیں اپنے فطری ماحول کے مطابق ہو جائیں۔المختصر اس نظم میں شاعر نے کمال خوب صورتی کے ساتھ بن نگاری کے عنصر کو پیش کیا ہے جو صرف اور صرف واحد اعجاز میر کا خاصہ ہے۔

برفباری اور بارش فطرت کے عوامل میں سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا آج بھی بارش اور برفباری کا ذکر کرتے ہیں تو وہ گویا فطرت کی تصویر کشی کر رہے ہوتے ہیں۔ برف باری سے ماحول پر ایک سفید چادر چڑھ جاتی ہے۔ جس سے زندگی کے نئے آثار برآمد ہوتے ہیں۔ برفباری درحقیقت فطرت کی طرف سے پانی کو زیادہ دیر تک بغیر خرابی کے بچائے رکھنے کا عمل ہے۔ جس سے ماحول پر ایک خوشگوار اثر بھی ہوتا ہے۔ برف باری میں چند چیزیں بہت خوش ہوتی ہیں تاہم جو ہجرت کر کے برفانی علاقوں میں آیا ہوا سے بہرحال برفباری میں سردی کی شدت سے خطرہ رہتا ہے۔ اسی لیے برف مخصوص علاقوں کے لیے ہے جہاں پر اسی طبیعت کے جاندار آباد ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر دراصل پہاڑوں پر مشتمل علاقہ ہے جہاں پر برفباری کا ہونا ایک فطری عمل ہے یہی وجہ ہے کہ شعرائے کشمیر کے یہاں برف باری کے موضوع پر بہت سی شاعری کی گئی ہے برف باری کے موضوع پر صابر آفاقی کی نظم ملاحظہ کیجیے:

برف باری پہلا منظر

ہو رہا ہے شب سے برف نقرئی کا پھر نزول

یا چھڑکتے ہیں فرشتے خاک پر بیلے کے پھول

اول اول ایسے لگتا ہے رخِ ارض صفا

جیسے دودآہ سے ہوتا ہے دھندلا آئینہ

آتے ہیں گالے زمیں پر پیچ و خم کھاتے ہوئے

اپنی تابانی سے مہرومہ کو شرماتے ہوئے

جیسے حوروں کی قطاریں، جیسے باران حباب

جیسے گرتے ہوں زمیں پر بارہ ہائے آفتاب

کرمک شب تاب جیسے ہوں کہیں گرم سفر

جیسے گردوں سے اُترتے ہوں ستارے خاک پر

جیسے رقصاں ہوں فضا ئے آسماں میں تتلیاں

یا شکست سبحہ ہائے قدسیاں کا ہو سماں

دوسرا منظر

بچھ چکی حد نظر تک ایک چادر نور کی

جس کی ضو پاشی سے خیرہ ہے نگاہ آدمی

جیسے ہوتی ہے کسی آہو کی ساق مرمریں

جیسے سینا کی تجلی جیسے زاہد کی جبیں

یا دل مرد خدا، یا چشم مفلس یا گہر

دست قدرت نے بچھا یا فرش مرمر سر بسر

ہر بلند و پست پر یکساں ہوئی باران نور

آج کٹیا پر بھی رکھا چرخ نے احسان نور

رشک کرتے ہیں ستارے قسمت خاشاک

آہک تفتہ چھڑک ڈالا ہے گویا خاک پر

لیلی فطرت نے اوڑھی آج نورانی نقاب

گوشے گوشے سے ابل نکلا ہے نور آفتاب

تیسرا منظر

باد برفانی کے جھونکے برف سے مل کر چلے

جیسے انسان کے بدن پر نشتر و خنجر چلے

طائران خوش نوا بن میں اکڑ کر رہ گئے

بستروں میں آدم خاکی سکڑ کر رہ گئے

کانگڑی ہم سے کرا لیتی ہے اس کا اعتراف

ڈھونڈتی پھرتی ہے آتش بھی پنہ زیرِ لحاف

یوں لرزتا ہے تن ہر مرد و زن برنا و پیر

جس طرح مجرم کا دل گل کی کلی تازہ اسیر

یوں لرزتے ہیں لحافوں میں جواناں جری

دست عالی جس طرح کانپیں بوقت عاجزی

ہاتھ میں رعشہ بدن میں کپکپی مختل دماغ

کوئی ایسے میں کرے کیا شاعری کس کو فراغ[۲۰]

یہ نظم تین مختلف حصوں پر مشتمل ہے جس کے تینوں حصوں میں بن نگاری کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایک شاعر جب اپنے مشاہدے کو الفاظ کا روپ عطا کرتا ہے تو اس کی حسیت اور حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح صابر آفاقی نے اپنی نظم میں برفباری کا تذکرہ کیا ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ماحول کے لیے محبت اور فطرت کے لیے بہت زیادہ ہے ۔ان کی فطرت کی اس انداز میں تصویر کشی کرنا ان کی فطرت اور فطری عناصر کے لیے محبت کا لازوال اور منہ بولتا ثبوت ہے۔

پہلے حصے میں ڈاکٹر صابر آفاقی نے برفباری ہونے کے منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کمال مہارت کے ساتھ برفباری کے منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں برف باری کے منظر کو بیان کرنے کے لیے اس طرح کا انداز اختیار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔یہاں پر شاعر ایک ایسی جگہ کی بابت اور ایک ایسے منظر کی عکاسی کر رہے ہیں جو انسانی خردبرد سے بالکل محفوظ ہے۔ دوسرے منظر میں ایک ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جس میں ہر طرف برف ہی برف ہے۔ اس کی چمک ہر طرف پھیل رہی ہے ہر طرف فطرت نے اپنی پسند کا رنگ بکھیر دیا ہے۔یہ ایک ایسا منظر ہے جس سے ہر چیز روشن اور تاریک رات میں بالکل واضح نظر آتی ہے۔ رات کے وقت میں ہونے والی برف باری سے ایک نورانی پردہ زمین کے رخ پر نمودار ہورہا ہے۔ یہ چمک اور اس کی ضیا اتنی زیادہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گوشے میں کوئی سورج چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے دو مناظر میں فطرت کی خوب صورتی اور جان فشانی کی بات کی گئی ہے۔جب کہ تیسرے منظر میں شاعر نے برف کے باعث ہونے والے ان اثرات کی بات کی ہے جو وہاں پر موجود انسانوں سمیت بقیہ جانداروں پر مرتب ہوئے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ انسان معاشرے اور فطرت کا عنصر ہونے کے باوجود یہ فطرت کی شدت اور سختی برداشت نہیں کر سکتا شاعر ڈاکٹر صابر آفاقی نے انسان کی اسی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بن نگاری صرف اس صورت میں انسان کی نفی کرتی ہے جب وہ انسان فطرت اور فطری چیزوں کے لیے خطرہ بنا ہوا ہو۔ اس صورت میں یہ انسان کو اپنے ساتھ شامل رکھتی ہے کہ جب انسان بھی فطرت میں موجود ہو کر باقی تمام فطری عناصر کی طرح زندگی گزار رہا ہو۔ یہاں بھی انسان کی ایک ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جس میں اس کو فطرت کا ایک عنصر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اسے کسی بھی صورت میں بقیہ جانداروں سے افضل و برتر نہیں کہا گیا۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کی نظم بن نگاری کی ذیل میں ایک عمدہ اضافہ ہے جس میں ماحول فطرت ماحولیاتی عوامل اور ماحولیاتی عناصر کو ایک ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں کسی ایک مخلوق کو کسی دوسری پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ بل کہ تمام کی تمام مخلوقات اور ماحولیاتی عناصر برابری کی سطح پر رکھے گئے ہیں کسی بھی چیز کو کسی دوسری چیز سے کم تر نہیں کہا گیا نہ ہی بشر مرکزیت کی کوئی چھاپ اس نظم پر دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد کہیں پر یہ ہلکا سا شائبہ نہیں ہوتا کہ شاعر نے کہیں

پر بھی فطرت کے خلاف انسان کو باقیوں سے افضل ہونے پر بات کی ہو۔ دراصل تمام کے تمام ماحولیاتی عناصر برابری کی سطح رکھے گئے ہیں۔

III غزل میں بن نگاری:

آزاد کشمیر میں غزل کا میدان بہت وسیع ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو غزل میں وہی تمام موضوعات زیر بحث رہے ہیں جو اردو غزل کی روایت رہی ہے۔اردو غزل کی قدیم روایت کے مطابق اس میں صرف محبوب ہجروصال، دنیا کی بے ثباتی یا کبھی کبھار تصوف کے موضوعات شامل کر دیے جاتے تھے۔ مگر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی روایت شکنی کے بعد اردو غزل میں بہت سے ایسے موضوعات در آئے جو اس وقت غزل کے موضوعات نہیں تھے۔ اردو غزل نے کروٹ بدلی تو اس میں مختلف طرح کے موضوعات کو جگہ مل گئی۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے غزل کے میدان میں نت نئے تجربات کیے ہیں ۔اپنی غزل میں شعرائے کشمیر کافی حد تک اپنے ماحول کی پیش کش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو صرف اور صرف ان کا ہی ملکہ ہے۔

آزاد کشمیر کے شعرا نے اپنی غزل میں بن نگاری کے نمونے بھی چھوڑے ہیں جنھیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ آزاد کشمیر کے شعرانے جو دیکھا اسے رقم کر لیا۔ جو کیفیات دل پر گزریں انھیں لکھ لیا۔ جو گردوپیش میں دیکھا تحریر کرکے باقی سب لوگوں کو بھی اس سے آگاہ کر دیا۔ آزاد کشمیر کا فطری اور جغرافیائی ماحول ایسا ہے کہ جس سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے۔ شاعرباقی لوگوں سے زیادہ حساس طبیعت کا مالک ہونے کی وجہ سے اپنی شاعری میں ماحول اور گرد و پیش کے حالات و واقعات کا بیان بھی زیادہ کرتا ہے۔ جیسے آزاد کشمیرکے پہاڑوں پر برف گرتی ہے اس لیے یہاں کے شعرا شاعری میں پہاڑوں کا ذکر اور وہاں کے موسموں کی نیرنگی کا ذکر بہت زیادہ کرتے ہیں۔ سید قاسم سیلانی کی غزل سے اشعار ملاحظہ کریں:

برف گرتی ہے کوہساروں پر

مان جاؤ کہ سرد موسم ہے

سب پرندے ہیں سہمے سہمے سے

چہچہاؤ کہ سرد موسم ہے[۲۱]

ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے نہایت سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ فطرت کی بات کی ہے ایک ایسے فطری ماحول کی بات کی گئی ہے جو انسان سے کوسوں دور ہے۔ ایک ایسی جگہ کی بات کی گئی ہے جہاں پر برف پڑی ہوئی ہے۔ سردی کی شدت کی بات کی گئی ہے۔ دوسرے شعر میں آزاد ماحول میں جینے والے پرندوں کی بات کی گئی ہے جو سردی کی شدت کے باعث افسردہ ہیں اور سہمے ہوئے ہیں۔ شاعر قاسم سیلانی ان سے چہچہانے کو کہ رہے ہیں دراصل شاعر ایک خطہ ارضی اور ماحولیاتی عنصر کی بات کر رہے ہیں جس پر انسانیت سوز سلوک نام کی کوئی چیز نہیں ۔بل کہ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو فطرت کی زیر اثر ہیں جن پر کوئی تسلط نہیں ہے بل کہ آزاد ماحول میں سانس لے رہی ہیں۔ ان تمام چیزوں پر صرف اور صرف فطرت حکمران کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ جس کو بن نگاری کی ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ بن گاری کی ذیل میں ماحولیاتی عناصر کا بیان کیا جاتا ہے۔

انسان کی فطرت کے ساتھ بیگانگی نے اسے فطرت سے کہیں دور کر دیا ہے۔ یہ دوری اتنی بڑھ چکی ہے کہ انسان واپسی اختیار کرنا بھی چاہے تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ تاہم فطرت کا شکر گزار ہونا ہر انسان کے لیے لازم ہے۔فطرت انسانی حیات سمیت ہر ایک زندگی کے لیے بہت لازمی ہے فطرت سے انسان کا لازوال رشتہ بہت پرانا ہے۔ جس میں فطرت سے انحراف ممکن ہی نہیں۔ فطرت ہر چیز کے لیے بہت ضروری ہے شعرا اس احساس کو اجاگر کرنے کے لیے شاعری کے ذریعے تبلیغ کر رہے ہیں۔ شاعر شفیق راجا کا شعر ملاحظہ کیجیے:

عروس صبح ہواؤں کی تازہ کاری سے

ترے وجود کی نس نس میں تازگی ہے بہت[۲۲]

غزل کے شعر میں شاعر نے انسان اور فطرت کے درمیان موجود بہت کو مد نظر رکھتے ہوئے فطرت کی بالادستی کی بات کی ہے وہ فطرت کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہوئے انسان کی فطرت کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی کے باوجود فطرت کی انسان لیے محبت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ اس شعر میں فطرت کی غیر جانبداری کو موضوع بنایا گیا ہے کہ یہ فطرت ہی ہے جس کے ہونے سے حیات کا چشمہ جاری و ساری ہے بن نگاری میں اس کی عکاسی کی گئی ہے۔ ماحولیاتی چیز کی پیش کش کی جا سکتی ہے جیسے کسی پھول یا پتے کی پیش کش کرنا بھی بن نگاری کی ذیل میں آتا ہے۔ اس کا بن نگاری کی ذیل میں آنا مشروط ہے اس لیے کہ اگر اس پر انسانی تہذیب و ثقافت کے اثرات پڑے ہوئے ہوں اور ماحول بگڑ رہا ہو تو اس صورت میں یہ بن نگاری کی ذیل میں نہیں آتا تاہم اگر اس پر برے اثرات نہ ہوں یا پھر اس کا نوحہ سنایا گیا ہو تو اسے بھی ہم بن نگاری کی ذیل میں شامل کریں گے جیسے شفیق راجا کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

تیز ہوا تھی پتے سر کے پھول کا چہرہ زرد ہوا

پیڑ کی کوکھ میں ٹیس اٹھی ہر شاخ کے دل میں درد ہوا [۲۳]

اس شعر میں ایسی فطرت کی بات کی گئی ہے جو انسانی بالادستی کی قائل نہیں ہے۔ ایسے پھولوں کا نوحہ بیان کیا گیا ہے جو فطرت کے باعث زرد ہوئے ہیں۔جو گزرتے موسم کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک پہنچ چکے ہیں۔پیڑ کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے گویا وہ پیڑ اپنے پتوں کے باعث غمزدہ ہےاس کا یہ غم وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جو فطرت کے لیے حقیقی معنی میں درد رکھتا ہو۔ پیڑ کو خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اس کو اپنے پتوں کے گرنے اور پھولوں کے زرد ہونے کی کافی تکلیف ہوتی ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں اکثر اشعار میں فطری موجودہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ شعرا اپنے آپ کو کسی فطرت کے وجود کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور خود کو وہی چیز قرار دیتے ہیں۔ کاشف رفیق کی غزل میں سے ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

نہیں پھول میں کہ مری طرف کسی خوش نظر کی نگاہ ہو

میں تو ایک زرد سا پات ہوں کہیں راستے میں پڑا ہوا [۲۴]

اس شعر میں شاعر کاشف رفیق اپنے آپ کو ایک زرد سا پتّہ قرار دے رہے ہیں شاعر کے نزدیک ان ایک انسان کی حیثیت ایک زرد پتے کی ہی ہے انسان مرکزیت کے خلاف بیان یہ ڈاکٹر شفیق کی فطرت پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں انھوں زردپات کو ایک انسان کے تشابہ کہا ہے۔ شاعر خود کو ایک پھول سے کمتر سمجھتے ہوئے اپنا محتاط بیانیہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا پھول نہیں ہیں کہ جسے دیکھ کر لوگ باقی فطری چیزوں کی طرح پسند کریں گے بل کہ وہ ایک زرد پتے کی مانند ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دراصل شاعر نے بن نگاری کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انسان کی مرکزیت کی بجائے فطرت کی اولیت کی بات کی ہے کہ فطرت انسان سے مقدم ہے کیوں کہ انسان خود بھی فطرت کے عناصر میں سے ایک عنصر ہے جو فطرت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔

فطرت ہمارے چاروں طرف موجود ہے اس کائنات میں موجود ہر اک چیز فطرت کی کتاب ہے۔ کوئی بھی چیز کی قدرت کی پکڑ اور قدرت سے باہر نہیں انسان جو خود کو اس دنیا کا واحد وارث تصور کرتا ہے۔ اس کو بھی فطرت اپنے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ہر ایک چیز حقیقی معنی میں فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے اس لیے فطرت سے کسی کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ فطرت نظام شمسی سے ہی ترتیب پاتی ہے ناز مظفر آبادی کا یہ شعر ملاحظہ کریں۔

دکھائی دیتے ہیں ہر سو مظاہر قدرت

نظام شمس و قمر کو فجر کو دیکھتے ہیں [۲۵]

ہمارے گردوپیش میں جو بھی فطرت کے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں در حقیقت نظام شمسی کے باعث ہی نظر آتے ہیں کیوں کہ زمین کا سورج کے گرد چکر لگانا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ایک نئے فطری عمل کو جنم دیتا ہے۔ گویا یہ سارے کا سارا فطری نظام نظام شمسی کی حرکت کے باعث بنتا ہے۔ جس کے بعد یہ کرہ ارض حیات کے قابل ہوتا ہے۔ ناز مظفر آبادی کی غزل میں کافی فطری شاعری موجود ہے۔ وہ فطرت کو خالص فطرت کی نظر سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری میں فطرت فطری انداز میں داخل ہوتی ہے۔ جس سے کسی بھی طور پر اجتناب نہیں کیا جاسکتا ناز مظفر آبادی اپنی

غزل کو فطرت کے احساس سے عاری نہیں رہنے دیتے۔ وہ فطرت کی مہربانی اور اس کے مظالم کو بیان کرتے ہیں ان کی غزل سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

بھری بہار میں مرجھا گیا کوئی غنچہ

کوئی گلاب شگفتہ خزاں میں رکھا گیا [۲۶]

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ فطرت ایک اٹل حقیقت کا نام ہے۔ چند معاملات میں فطرت بالکل معصوم بچے کی مانند ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کبھار ایک جابر اور سنگ دل انسان کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ جہاں اسے کسی کی پیدائش کی خوشی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کی موت پر رنج ہوتا ہے۔ شاعر نازمظفر آبادی نے اس شعر میں فطرت کی اسی بے رخی کی بات کی ہے۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس شعر میں بن نگاری کے اس پہلو کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جو انسانی تسلط کے باوجود خرد برد سے محفوظ ہے۔ اسی سلسلے میں ناز مظفر آبادی کی غزل سے ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

گو خزاؤں کا دور دورہ ہے

پھول کھلنے کی آس ہے اب تک [۲۷]

اگرچہ یہ شعر مختلف معنی دے رہا ہے تاہم اس شعر میں بھی فطرت کی بات کی گئی ہے۔ فطرت کی آنکھ مچولی کے باعث موسم تبدیل ہوتے ہیں۔ موسموں کی یہ رنگارنگی انسانی دست برد سے محفوظ ہی رہی ہے۔ شاعر نے پرامید لہجے میں موسم خزاں کے جانے اور بہار کے آنے پر پھول کھلنے کی آس کا اظہار کیا ہے۔ جس سے شاعرکا فطرت پر ایقان ظاہر ہوتا ہے۔ ہر ایک درخت کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ضروری نہیں کہ ہر درخت سے انسان کو ثمر ہی ملے کچھ درخت فطرت کی خوب صورتی کے لیے ہیں۔ ہر دو طرح سے درخت فطرت کا شاہکار ہے جو نہ صرف انسان بل کہ ایک فطری عنصر کے لیے ہر طرح سے ضروری ہے۔ ناز مظفر آبادی کا شعر ملاحظہ کریں:

لاکھوں ہیں یہاں پیڑ گلستان کی رونق

ہر پیڑ مگر ان میں ثمر دار نہ ہوے [۲۸]

جھکائی جاتی ہیں بارِ ثمر سے کچھ شاخیں

وہ شاخ شاخ کو گلشن خم نہیں کرتا[۲۹]

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ نازمظفرآبادی اپنی غزل میں بھی فطری چیزوں کو کافی دیر تک نظریے سے مشاہدہ کرنے کے بعد پیش کرتے ہیں۔ بن نگاری ہر اس تحریر کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جس میں ایسے ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے جو فطرت اور فطری حقیقت پر مبنی ہے۔ پیڑوں کے ساتھ پھل لگنا یا نہ لگنا ایک فطری امر ہے جو انسانی دسترس سے باہر کی بات ہے۔ فطرت خوب صورت ہے اس کا احساس اس سے کہیں زیادہ مسحور کن ہے۔ فطرت ہر گزرتے پل کے ساتھ ہمیں نئے سے نئے روپ میں دکھائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعرائے کشمیر کے شعر میں جابجا ملتی ہے احمد عطا اللہ کا شعر ملاحظہ کریں:

گلیوں گلیوں سوندھی خوشبو پھیل گئی

پہلے پہلے پھول کھلے خوبانی میں [۳۰]

شاعر احمد عطا اللہ فطرت کے رنگوں کی بات کر رہے ہیں ۔ایک فطری عمل کو اپنی شاعری میں پیش کر رہے ہیں۔ ایک ایسے فطری عمل کی تصویر کشی کر رہے ہیں کہ جو انسان کی دسترس میں نہیں ہے ۔جس پر انسان کا کوئی زور نہیں فطرت کا فطری انداز میں بیان بن نگاری کہلاتا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ خوبانی کے پھول کھلنے کی وجہ سے ہر طرف خوشبو پھیل گئی ہے یعنی یہ بھی فطرت کی بات ہے۔ گویا یہ بھی بن نگاری کی مثال ہے کیوں کہ خوبانی کے پھولوں کی مہک وجہ سے لوگوں کو مسحور ہونے کا موقع ملا ہے۔یہ بات واضح انداز سے انسان کے سامنے آتی ہے اس کی اس قدر نیرنگی اس کو بہت خاص بنا دیتی ہے۔ ایک شاعر تو فطرت کا سب سے بڑا مداح اور شناسا ہے اس کی شاعری میں فطرت خوب صورت انداز میں سامنے آتی ہے۔ صابر آفاقی کی غزل سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ساحل ساحل ریت پڑی ہے

دریا چڑھ کر اترا ہو گا

قوس قزح کو سوچ کے دیکھو

فطرت نے کچھ لکھا ہو گا [۳۱]

درج بالا غزلیہ اشعار میں شاعر نے خوب صورت انداز میں فطری چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ فطری عناصر کو اس طرح بیان کرنے کے لیے قدرت کا مشاہدہ لازمی جزو کے طور پر سامنے آتا ہے۔ شاعر کی زیرک نظری نے اس قدر بلند پائے کے اشعار کو تخلیق کرنے میں مدد دی ہے۔ کیوں کہ فطرت میں گھلے ملے بغیر فطرت کی تعریف کرنا اور اس انداز میں کرنا کے انسانی عمل دخل بھی شامل نہ ہو کافی دشوار کام ہے۔ لیکن شاعر صابر آفاقی اس کام کو بہت خوب صورتی کے ساتھ فطری انداز میں سرانجام دیتے ہیں جس سے فطرت کی بالادستی ظاہر ہوتی ہے۔ قوس قزح کو فطرت کی تحریر کہنا بذات خود ایک ایسی بات ہے جس سے فطرت کی بالادستی ظاہر ہوتی ہے۔ فطرت کے انداز بالکل نرالے اور انوکھے ہیں۔ فطرت نے کئی کئی طرح کے رنگ ظاہر کرنے ہوتے ہیں شاعر نے ایسے غیرانسانی اور فطری ماحول کی تصویر کشی کی ہے۔ جس میں چند فطری چیزیں بلاشبہ پریشان دکھائی دیتی ہیں۔ شعر ملاحظہ کریں:

بلبل خموش، غنچے فسردہ، فضا اداس

دیکھا ہے یوں بھی جشن بہاراں کبھی کبھی [۳۲]

اس شعر میں پرندوں کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ضروری نہیں کہ بہار کے موسم میں ہمیشہ ہیں کوئی بلبل خوشی کے نغمے گنگنائے۔ کوئی کلی کھلے اور اپنے رنگ جمائے۔ فضا معطر ہی رہے گی ان میں سے کوئی بھی چیز لازمی نہیں ہے کیوں کہ کچھ چیزیں موسم کے بدلنے سے بھی نہیں بدل سکتیں۔ باہر کا موسم اندر کے موسم کو بدلنے سے قاصر رہتا ہے۔ یعنی فطرت کے رنگ باہر کو تو بدل سکتے ہیں مگر اندر کے وجود کو کسی بھی حالت میں خوشی میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ مگر فطرت کو اس

سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ صرف اور صرف مقررہ وقت کی پابند ہے۔ فطرت کسی کی دل جوئی کی طرف کبھی مائل نہیں ہوتی۔

انسان کی نظر زیادہ تک انھی مقامات کی طرف ہوتی ہے جو آسانی کے ساتھ اسے دستیاب ہو جائیں۔ ایسی تمام جگہوں کی فطری زندگی اسے اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہتی ہے جن کو پانے کے لیے بہرحال دشواری ہوتی ہے۔ صابر آفاقی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

آگاہ میرے حسن سے کوئی نہ مہک سے

اک پھول ہوں جو خلوت صحرا میں کھلا ہوں [۳۳]

شعر میں ایک پھول کو صحرا میں کھلا ہوا قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کوئی بھی اس سے واقف نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پر موجود ہے جہاں اس کی خوب صورتی کا کوئی قدردان نہیں ہے۔ درحقیقت شاعر نے ایک ایسے کرہ ارضی کو شعر کی زینت بنایا ہے۔ جو انسانی عمل دخل سے بالکل ہی شفاف ہے۔ جس میں وہی شاعری شامل کی جاتی ہے جس میں فطری ماحول کی عکاسی ہو۔ اس شعر میں بھی ایسی ہی جگہ کی پیش کش کی گئی ہے۔ جو شاعر کی فطرت کے لیے محبت اور مشاہدے کی گہرائی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی تسلسل میں شاعر صابر آفاقی کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

یہی گلستانِ وجود میں گل خندہ رو کا نصیب ہے

جو نگاہ مہر سے بچ گیا تو شکار جورِ خزاں ہوا [۳۴]

یہ شعر بھی گزشتہ اس شعر کی طرح ہی ہے جس میں شاعر مرکزی کردار کی صورت میں تو ظاہر نہیں ہوتے لیکن ایک ناظر کی صورت میں وقوع پذیر ضرور ہوتے ہیں۔ شعر میں عام مشاہدے کی بات کی گئی ہے۔ یعنی ایک ایسے پھول کی بات کی گئی ہے جو بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ جس پر سورج کی تپش نے اپنا اثر نہیں دکھایا۔ وہ پوری طرح سے محفوظ رہا تاہم وقت بدلنے کی وجہ سے اس کی خوب صورتی اور تازگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے موسم نے مسخ کر دیا۔ یعنی قاعدہ ہے کہ جس نے بھی زندگی پائی ہے موت اس کا مقدر ہے اس نے ہر حال میں اس دنیا سے چلے جانا ہے۔ کسی بھی

چیز کو ثبات نہیں ہے۔ ثبات صرف فطرت کو ہے یہ شعر بن نگاری کی ذیل میں اس لیے شامل کیا گیا ہے کیوں کہاس میں انسان کی نفی کے نقوش ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہ شعر بن نگاری کے لحاظ سے ایک باکمال فن پارہ ہے۔

IV حیات مرکزیت:

حیات کے لغوی اور لفظی معنی زندگی کی زندگی کا لفظ اپنے بہت وسیع معنی و مفہوم رکھتا ہے۔ اس لفظ میں صرف انسانی زندگی نہیں بل کہ زندگی کی ابتدا سے لے کر لمحہ موجود کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ یعنی زندگی کی ابتدا تو یک خلوی جانداروں سے ہوئی جو بعد ازاں کثیر خلوی جانداروں کا موجب بنے۔ حیات مرکزیت کی اصطلاح میں مرکزیت کو بھی کافی اہمیت کو حامل سمجھا جاتا ہے۔ مرکزیت لفظ مرکز سے نکلا ہے جس کے معنی دائرے کے ہیں۔ حیات مرکزیت کی اصطلاح کو بغور دیکھنے اور پرکھنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ اصطلاح زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ یہ ہر اس نظریے کی ترجمان ہے جو فلسفیانہ اور تفکرانہ بنیادوں پر زندگی کو اہمیت دیتا ہے۔

حیات مرکزیت ماحولیاتی تنقید کا بنیادی نظریہ ہے۔ جس کے مطابق ہر ایک ماحولیاتی عنصر برابر ہے۔ ہر ایک چیز کو برابری کی سطح پر جینے کا حق حاصل ہے۔ کسی بھی چیز کو مرکزیت حاصل نہیں ہے۔ یہ نظریہ دراصل بشر مرکزیت کا رد عمل سمجھا جاتا ہے کیوں کہ بشیر مرکزیت کا نظریہ تو برس ہا برس سے چلا رہا ہے۔ کئی لوگوں نے اس نظریے پر مذہبی عقائد بھی کھڑے کر لیے ہیں۔ لیکن ماحولیاتی تنقید پوری طرح سے اس نظریے کی مخالفت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید ایسے تمام باطل نظریات کے خلاف نہ صرف احتجاج کر رہی ہے بل کہ اس کی مخالفت میں کافی منطقی انداز فکر اپناتے ہوئے انسان پر یہ باور کروانے کی کوشش کرتی ہے کہ انسان بھی باقی ماحولیاتی عناصر کی طرح ہی ایک ماحولیاتی عنصر ہے۔ جو نہ تو کسی کے لیے بنا ہے اور نہ ہی یہ دنیا اس کے لیے بنی ہے۔ بل کہ یہ ہر ایک چیز فطری عمل کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا انسان کو بھی ایسے ہر باطل نظریے سے دور ہی رہنا چاہیے کہ جس کے مطابق انسان ہی اس سرزمین کا مالک ہے۔ یہ سرزمین اور جو کچھ اس میں ہے سب کا سب انسان کی وجہ سے ہے۔

جدید انسانی ذہن نے تمام تر قدیم اور فرسودہ خیالات پر سوالات کھڑے کر دیے ہیں جدید سائنسی ذہن انسان کو بھی باقی جانداروں میں سے ایک جاندار سمجھتا ہے یہ اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ انسان باقی جانداروں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ اور ذہین ہے یہ بات اپنی جگہ بجا ہے کہ انسان باقی مخلوقات سے زیادہ ذہین اور

ترقی یافتہ ہے اس بات کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ یہ باتوں سے افضل اور اکمل ہے انسانی بستیوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انسانی بستیوں میں رہنے والے لوگ بھی ایک ہی طرح کے ذہین اور ترقی یافتہ نہیں ہر ایک انسان کی ذہنی استعداد دوسرے انسان کی ذہنی استعداد سے مختلف ہے ہر علاقہ برابر ترقی یافتہ نہیں اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ترقی یافتہ ممالک کی غیر ترقی یافتہ ممالک پر چڑھ دوڑے اور ان کے گھر بار زندگیوں اور ثقافتوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔ چناں چہ رابرٹ لانزا لکھتے ہیں:

> Indeed, it is here that biocentrism arrives at a very different view of reality than that which has been generally embraced for the last several centuries. Most people, in and out of the sciences, imagine the external world to exist on its own, with an appearance that more or less resembles what we ourselves see. Human or animal eyes, according to this view, are mere windows that accurately let in the world. If our personal window ceases to exist, as in death, or is painted black and opaque, as in blindness, that doesn't in any way alter the continued existence of the external reality or its supposed "actual" appearance. A tree is still there, the moon still shines, whether or not we are cognizing them. They have an independent existence. By this reasoning, the human eye and brain have been designed to let us cognize the actual visual appearance of things, and to alter nothing. True, a dog may see an autumn maple solely in shades of gray, and an eagle may perceive much greater detail among its leaves, but most creatures basically apprehend the same visually real object, which persists even if no eyes are upon it.[۳۵]

اس اقتباس سے یہ بات بہت واضح ہوجاتی ہے کہ مصنف اس بات پر زور ڈال رہے ہیں کہ دنیا کی کسی بھی چیز کو کسی دوسری چیز کے لیے نہیں بنایا گیا۔ معلوم نہیں کہ دنیا کب سے اور کب تک رہے گی لیکن یہ بات تو طے ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے نہیں بنائی گئی کیوں کہ یہ دنیا انسان سے پہلے بھی موجود تھی اور انسان کے مر جانے کے بعد بھی موجود رہتی ہے

ماحولیاتی تنقید میں حیات مرکزیت کا نظریہ اس کی بنیاد ہے جس کے مطابق ہر ماحولیاتی عنصر برابر اہمیت کا حامل ہے۔ انسان یا کسی بھی ماحولیاتی عنصر کو کسی دوسرے ماحولیاتی عنصر کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بل کہ یہ تمام کے تمام فطری عمل کا نتیجہ ہیں۔ حیات مرکزیت زندگی کو اہم مانتے ہوئے سب سے بڑا درجہ زندگی کو دیتی ہے جس کے مطابق زندگی ہی کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ زندگی چوں کہ اس کرہ ارض پر سلامت ہے اور پھل پھول رہی ہے لہذا اس نسبت سے زمین کو بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی تمام کے تمام ماحولیاتی عناصر برابر ہیں۔ زمین اور زندگی ایسی چیزیں جو باقی تمام تر ماحولیاتی عوامل اور عناصر سے مقدم ہیں۔ یہ تقدیم کسی اور وجہ سے نہیں بل کہ بقا اور سالمیت کی وجہ سے ہے۔

زمین ہو گی تو اس زمین پر موجود باقی چیزیں بھی محفوظ رہیں گی۔ ورنہ کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ زندگی ہو گی تو ہر چیز کی بقا ہو گی۔ لہذا ماحولیاتی تنقید ہر جان دار کی برابری اور زندگی کی مرکزیت کی قائل ہے۔ ماحولیاتی تنقیدی نظریہ حیات مرکزیت میں ہر اس عمل کی مخالفت بھی کی گئی ہے جس میں کسی بھی ماحولیاتی عنصر کو انسانیت کے نام نہاد زعم کی نذر کر دیا گیا۔ وہ فن پارے جو انسانی زعم کی مخالفت میں ہوں یا پھر تمام تر ماحولیاتی عناصر کے درمیان برابری کے تعلقات کو ظاہر کریں حیات مرکزیت کے حامل ہوں گے۔ ایسے اشعار، نظمیں، افسانے، ناول وغیرہ ماحولیاتی تنقید میں حیات مرکزیت کے تناظر میں پرکھے جائیں گے۔

نظم میں حیات مرکزیت:

اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ انسان سمیت اس کائنات میں موجود جتنے بھی جاندار ہیں سب کے سب ایک ہی پیڑ کی شاخیں اور اس کے پتے ہیں۔ اس کائنات میں موجود ہر ایک مخلوق کسی نہ کسی طرح سے دوسری مخلوق کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اگر اس کو ہم وسیع تناظر میں دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ زمین ایک محتاط اور مناسب طریقے سے باقی سب سیاروں کے ساتھ ہوئی ہے۔ باقی سب

سیارے زمین سورج کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ سورج کا یہ کنبہ جو نظام شمسی کہلاتا ہے یہ بھی کسی نہ کسی طرح سے اپنی کہکشاں سے جڑا ہوا ہے۔ ہر کہکشاں ایک مخصوص طریقے سے دوسری کہکشاں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ الغرض اس کائنات کی ہر ایک چیز ایک مناسب اندازے اور طریقہ کار کے ساتھ دوسری کائناتی چیزوں سے جڑی ہوئی ہے۔ ایک ایٹم کی حرکت سے لے کر نظام شمسی اور اس کائنات کے ہر ایک اجرامِ فلکی میں موجود حرکت اس بات کی گواہ ہے کہ اس کائنات کی ہر ایک چیز دوسری چیز کے ساتھ با ہم مربوط ہے۔ گویا تمام کی تمام چیزوں کا منبع اور محور ایک ہی ہے۔ منور قریشی نے اپنی نظم میں اسی بات کا اظہار انتہائی سادہ اور خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجے:

یہ اک خوب صورت گھنا پیڑ ہے

جس کی شاخیں ہواؤں، فضاؤں، خلاؤں سے آگے نکل کر

محیط زمان و مکاں ہو رہی ہیں

ہر اک شاخ سرسبز اور ڈالی ڈالی پہ لاکھوں ہی پتے

گھنے پیڑ میں دوڑتے زندہ رس کا پتا دے رہے ہیں

مر اک سبز پتا خود اپنی حقیقت کو پائے ہوئے

زندہ رہنے کی خواہش کے جلتے ہوئے خوں کی حدت کی چمکیلی کرنیں سمیٹے

نئے آنے والے زمانے کی امید میں جھومتا ہے

ہواؤں سے بھرپور، بھرپور سانس آکسیجن سمجھ کر پیے جا رہا ہے

اُسے سب خبر ہے کہ بہتی ہوا میں

ملوں، کارخانوں سے اٹھتا دھواں زہر بن کر گھلا ہے

زمیں کے جلے جسم سے اڑتی گرد اس کے ماحول میں تیرتی پھر رہی ہے

گھنی ڈالیوں اور سرسبز پتوں کے جھرمٹ میں لاکھوں

کروڑوں حسیں اور رنگین چہرے

گلوں کی طرح سے

نئے دور کے سرخ خوں کا تلک اپنی پیشانیوں پر سجائے ہوتے ہیں

ذہن ان کے خشک اور زباں پانیوں کی طلب میں جلی

سنگ خارا سے تالو سے چمٹی ہوئی ہے

مگر وہ نئے آنے والے زمانے کی امید میں جھومتے ہیں

نئی نسل اک خوب صورت گھنا پیڑ ہے

اور گئے دن کی زرخیز اور کالی مٹی سے یہ پیڑ اک دن اگا تھا

گئے سال کی بیج پودا بنا تھا

اور اب!--

ایک اک شاخ سرسبز اور ڈالی ڈالی پہ لاکھوں ہی پتے

گھنے پیڑ میں دوڑتے زندہ رس کا پتا دے رہے ہیں

مگر اس شہر کو کوئی کاش میری نگاہوں سے دیکھے

(حقیقت کو سمجھے)

کہ اس خوب صورت شجر کا تعلق

زمیں اور زرخیز مٹی کی جلتی ہوئی کوکھ سے ٹوٹتا جارہا ہے

یہ اڑتی ہوا اور بھٹکتی ہوئی تند و تیز آندھیوں کے سہارے کھڑا ہے

ہزار اس کے سرسبز پتے ہیں اور پھول ہیں، ڈالیاں ہیں

ہزار اس کی شاخیں خلا میں ہیں لیکن

جڑیں اس شجر کی زمیں میں نہیں ہیں،

ہواؤں میں ہیں[۳۶]

اس نظم کے پہلے حصے میں شاعر نے نہایت خوب صورت انداز میں حیات مرکزیت کے عنوان کو برتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں زندگی کا ایک خوب صورت پیڑ ہے جو انتہائی طویل، جس کا تنا آسمان کی وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ یعنی اس نظم میں شاعر زندگی کے درخت کو ایک تناور درخت کہتے ہوئے اس بات پر مصر ہیں کہ زندگی کائنات کی ہر چیز میں موجود ہے جسے ہر ایک چیز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حیات مرکزیت کا یہ تصور اپنے آپ میں بالکل انوکھا اور نیا ہے جس میں شاعر یہ بات کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس کائنات میں موجود ہر ایک چیز زندہ ہے اور اس کی زندگی ایک تناور درخت سے منسلک ہے جس کی شاخیں جابجا پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ جو زمین اور آسمان کے درمیان تمام اجرام فلکی تک پھیلی ہوئی ہیں۔

شاعر اپنے آپ کو اسی درخت کا ایک پتا تصور کر رہے ہیں۔ گویا شاعر واشگاف الفاظ میں زندگی کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی بات کر رہے ہیں جس میں وہ اسی تصور کو پیش کر رہے ہیں کہ زندگی مربوط ہے۔ یہ باقاعدہ ایک مرکز کی حامل ہے۔ مگر آج کل کے ماحولیاتی تناظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاید اس بات پر کافی رنج کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہماری ہوا جسے ہم آکسیجن سمجھ کر اپنے اندر لیے جا رہے ہیں اس میں ملوں اور کارخانوں سے اٹھتا ہوا دھواں زہر بن کر ملا ہوا ہے۔ دھرتی کا پھٹا ہوا جسم اور اس سے نکلنے والی ہر طرح کی گیس اور فضا میں اڑنے والے ذرات گویا ہر ایک چیز زندگی کے لیے کافی نقصان دہ ہے۔ وہ آج کل کی مصنوعی زندگی پر بھی کافی رنج کا اظہار کر رہے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس شجر پر بنی ڈالیوں پر موجود جو پتے یعنی یہ انسان اور باقی جتنے بھی جاندار اس دنیا پر موجود ہیں وہ سارے کے سارے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

اس بات میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ زمین کا پانی سوکھتا چلا جارہا ہے۔ ہر طرف خشکی اور خشک سالی سر اٹھارہی ہے۔ لیکن پھر بھی امید ہے کہ شاید کوئی ایسا وقت بھی آجائے کہ جب یہ سب مسائل حل ہو جائیں اور تمام کے تمام جاندار دوبارہ سے فطرت کے ساتھ جینا شروع کر دیں۔ مگر شاعر یہاں اس بات کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ مستقبل قریب میں ایسا ہوتا ہوں ممکن نظر نہیں آرہا کیوں کہ یہ جو زندگی کا پیڑ ہے اس کا رشتہ اس کا ناتا زمین سے ٹوٹتا چلا جارہا ہے۔ یہ ہواؤں کی طرف گام زن ہوتا جارہا ہے گویا آج کل کے جاندار آج کل کی زندگی بری طرح سے متاثر ہو کر رہ گئی ہے۔ زندگی کا ناتا زمین سے ٹوٹ کر ہوا میں جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب زندگی کی کوئی حقیقت نہیں رہی اب زمین پر زندگی کو کئی طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے

یہاں اس بات کا تعین کرنا بھی ضروری ہے کہ حیات مرکزیت ہمیشہ بشر مرکزیت کے خلاف رہی ہے یہ ہر اس عمل کی نفی کرتی ہے۔ جس سے انسان کی بالادستی قائم ہوتی ہو اور انسان اپنی مرضی سے اس زمین پر شکست وریخت کر سکتا ہو۔ زمین پر موجود زیادہ تر مسائل کی وجہ انسان خود ہے۔ جس نے انسانیت کی راہ میں روڑے اٹکانے کے علاوہ فطرت کو بھی کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ حیات مرکزیت در اصل بشر مرکزیت کا رد عمل ہے جس میں انسان کی بالادستی کو ختم کر کے زندگی کی بالادستی قائم کرنے کی بات کی گئی ہے۔ اس نظم میں بھی شاعر زندگی کی بالادستی کی بات کر رہے ہیں اور زندگی کو ہی اہم مان رہے ہیں۔ الغرض یہ نظم بڑی شدت کے ساتھ بشر مرکزیت کے خلاف احتجاج ہے جس میں انسانی زعم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زندگی کو بھرپور اہمیت دی گئی ہے۔ جو حیات مرکزیت کا بنیادی نظریہ ہے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ فطرت ہی زندگی کو پروان چڑھاتی ہے اور زندگی کو آگے بڑھاتی ہے جس کے باعث ہی اس کائنات کی رنگارنگی ہے۔ اس کائنات میں موجود ہر شے اور اس کائنات کا وجود گویا فطرت ہی فطرت ہے۔ کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جسے فطرت سے باہر گنا جا سکے۔ فطرت زندگی پروان چڑھاتی ہے۔ اس کو پالتی پوستی ہے اور آگے تک لے کر جاتی ہے۔ البتہ فطرت اپنے آپ میں ایک بے رحم ماں کی مثل ہے کہ جو ایک پل میں کسی ایک چیز کو زندگی بخشتی ہے تو دوسرے پل کسی اور چیز کی زندگی اس سے چھین لیتی ہے۔ یہ زندگی کو مد و جذر سے گزارتی ہے۔ امتحانات سے گزرنے کے بعد زندگی سے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ کاش یہ زندگی نہ ہوتی تو میں آج خوب پر سکون ہوتا۔ فطرت جو زندگی کا مرکز ہے۔ حیات و ممات کو اپنے دائرے میں اس

طرح سے گھماتی ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اس حوالے سے منور قریشی کی ایک نظم پچھتاوا ملاحظہ کیجیے:

پچھتاوا

یہ بس کل کی بات ہے لوگو!

میں پودا تھا

کومل کومل.....نازک نازک

کچھ شاخیں تھیں

جن پر ریشمی ریشمی پتے لہراتے تھے

میں معصوم.....انجان دُکھوں سے

کتنا سکھی تھا!

پھر یہ بھی کچھ دن پہلے کی بات ہے لوگو!

کہ میں بیج تھا

اپنے خول میں سکڑا سمٹا

بے پرواہ زمانے کے سب ہنگاموں سے

مٹی کی آغوش میں غافل، چین سے سویا

اپنی ذات کے اندر گم سم کتنا سکھی تھا!!

اور اب میں پھلدار، تناور، گھنا شجر ہوں

گھر کے آنگن سے گھر کی بوسیدہ چھت تک

میری بار آور شاخوں کے خوان سجے ہیں

میرا مقدر!

آندھیاں، طوفان، پتھر، اولے، سڑتا پانی

اور سورج کی جلتی کرنیں!

جانے ظالم وقت نے کیسے مجھ معصوم کو بھکایا تھا؟

کیوں اپنے بڑھتے ہوتے قد پر

مجھ خوش فہم کو پیار آیا تھا؟

میں کیوں گھنا درخت بنا تھا؟

میں کیوں پودا ہی رہنے کی نعمت سے محروم ہوا تھا؟

میں کیوں روشنی کی چاہت میں

بیج کے اندھیارے سے پھوٹ پڑا تھا؟

میں کیوں مٹی کی ممتا کو تیاگ آیا تھا؟[۳۷]

یہ نظم بھی اپنے آپ میں بشر مرکزیت کے خلاف ایک رد عمل کے طور پر سامنے آتی ہے جس میں شاعر زندگی اور اس سے متعلق باقی ساری باتوں کو انتہائی خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جہاں یہ نظم زندگی کے اتار چڑھاؤ پر بحث کرتی ہے وہیں پر زندگی کے بنیادی اصولوں پر بھی محوِ گفت گو نظر آتی ہے۔ اس نظم میں شاعر ایک بیج کی کہانی سناتے ہیں کہ جو پہلے کبھی کبھار بیج ہوا کرتا تھا۔ مگر فطرت نے انگڑائی لی اور وہ بیج پودے کی صورت میں نمودار ہوا۔ فطرت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جاسکتی ہیں مگر اس کو روکا نہیں جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کی کسی بھی چیز پر فطرت اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

شاعر نے اس نظم میں بنیادی طور پر بیج کو زندگی کی علامت کے طور پر لیا ہے۔ فطرت کسی بھی طرح کسی بھی چیز میں زندگی بھر سکتی ہے۔ یہ زندگی کسی بھی طور پر اس سے متنفر نہیں ہو سکتی کیوں کہ فطرت کی رنگا رنگی محو سفر ہے۔ اس نظم میں اگرچہ زندگی سے کافی پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے امتحانات سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں تاہم یہ زندگی کسی پر بھی یک ساں گزری ہے نہ گزرے گی۔ لیکن ایک بات تسلیم شدہ ہے کہ زندگی اپنا راستہ کہیں نہ کہیں سے نکال لیتی ہے۔ اس کے راستے کو آج تک کوئی نہیں روک پایا۔ بشر مرکزیت کی بات کی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز انسان کی سہولت کے لیے پیدا کی گئی ہے لیکن اس بات سے فطرت پوری طرح سے انکار کرتی ہے کیوں کہ فطرت زندگی کو انسان کے لیے نہیں بناتی بل کہ انسان بھی فطرت کا ہی حصہ ہے۔

اس نظم کے کئی پہلو ہیں۔ یہ نظم پچھتاوا کئی پہلوؤں سے اپنے آپ کو حیات مرکزیت کے دائرے میں رکھتی ہے۔ اس نظم کے آخری حصے میں بیج اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ کاش وہ کبھی بڑا نہ ہوتا۔ کاش وہ کبھی کسی درخت کا روپ نہ دھارتا۔ کیوں کہ جو جتنا بڑا ہوتا چلا جاتا ہے اس کے امتحانات میں اتنا ہی زیادہ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے امتحانات اتنے ہی کٹھن اور دشوار ہوتے جاتے ہیں۔ وہ اتنی ہی مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ حیات مرکزیت بھی اسی بات کی تبلیغ کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے کہ زندگی انسان کی وجہ سے نہیں ہے بل کہ خود انسان زندگی کی وجہ سے قائم ہے۔ آخر پر بیج کا زمین کے لیے بولا گیا جملہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ شاعر حیات مرکزیت کے قائل ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ زمین کی وجہ سے زندگی ہے نہ کہ زندگی کی وجہ سے زمین کیوں کہ ایک بیج کو یہی زمین زندگی عطا کرتی ہے۔ جس نے باقی جان داروں سمیت انسان کو بھی زندگی عطا کی ہے۔ یہی زمین ہے جو ہر چیز کو اپنی ماں کی طرح پالتی، پوستی اور بڑا کرتی ہے۔ زمین فطرت کا حسین مظہر ہے۔

فطرت جیتی جاگتی زندگی کا نام ہے جس کے ہر پل میں کئی چیزیں نہیں بنتی ہیں اور کئی چیزیں ٹوٹتی ہیں۔ ہر پل ایک نیا جہان تخلیق ہوتا ہے تو کوئی پرانا جہان اپنی سانسیں مکمل کر کے صفحہ ہستی سے کہیں چلا جاتا ہے۔ فطرت کی یہ خصوصیت اسے تمام چیزوں سے بالاتر کر دیتی ہے۔ جہانوں کی تخلیق اور ان کی تنظیم و ترتیب ہر چیز فطرت کے دائرہ اختیار میں ہے۔ انسان بھی فطرت کے عناصر میں سے ایک عنصر ہے۔ جس کو کوئی مرکزیت حاصل نہیں بل کہ انسان خود کسی فطری عنصر کے آگے مجبور ہے۔ خشک سالی اس کو قحط تک لے جاتی ہے بارش کی زیادتی سیلاب کے خطرات اور تباہ کاریاں لے کر آتی ہے۔ اس کا اشرف المخلوقات ہونے کا نظریہ بالکل کھوکھلا اور بے بنیاد ہے۔

فطرت میں زندگی پنہاں ہے جس کو کسی کے ہونے یا نہ ہونے کی منتظر نہیں ہوتی بل کہ اسے اپنا اظہار چاہیے وہ کسی بھی مقام سے ابھر سکتی ہے۔ وہ کسی بھی وقت دھرتی کے بدن سے پھوٹ سکتی ہے فطرت کی اسی خوبی کو مد نظر رکھتے ہوئے واحد اعجاز میر کی نظم ملاحظہ کریں:

دنیائیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں

زمانے تخلیق ہوتے رہتے ہیں

موسم بدلتے رہتے ہیں

پھول کھلتے رہتے ہیں

ہوا میں چلتی رہتی ہیں

جنگل اُگتے رہتے ہیں

پانی بہتا رہتا ہے

بیج پھوٹتے رہتے ہیں

ہم اور سے اور کسی دنیا میں

جھانکتے رہتے ہیں

ہم مانگتے رہتے ہیں ۳۸

یہ نظم در حقیقت حیات مرکزیت کی نظموں میں سے ایک ہے جس میں دنیا کے بننے، سنورنے، بگڑنے اور بعد ازاں تباہ ہونے کے موضوع کو نہایت شاندار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جب اس دھرتی پر انسان نہیں تھا تب بھی اس کے موسم یوں ہی بدلتے تھے۔ انسان کی آمد سے قبل مخلوقات وجود میں آرہی تھیں۔ طرح کے پھل زمین کے بطن سے نکلے ہوئے درختوں پر اتر رہے تھے۔ وقت بے وقت بارش ہوا کرتی تھی۔ پانی کے ریلے یوں ہی بہا کرتے تھے۔ الغرض ہر چیز اپنے مقرر وقت کے مطابق ہو رہی تھی جیسے اب ہو رہی ہے۔ جب کوئی پرندوں کے آگے دانے نہیں ڈالتا تھا وہ بھی بھوک سے نہیں مرتے تھے۔ وہ آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔ یہ سب کام جو

فطرت کے ساتھ منسلک ہیں یوں ہی سر زد ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ہر ایک چیز یوں ہی رہے گی۔ انسان کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تاہم انسان کا وجود اس زمین کے لیے خطرہ ضرور ہے۔ اگر انسان نہ رہے تو اس کا فطری ماحول دوبارہ سے بحال ہو جائے گا۔ جنگلوں کی افزائش بھی ہونے لگے گی۔

شاعر واحد اعجاز میر قدرت کی اسی خصوصیت کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی یوں ہی برقرار رہتی ہے۔ یہاں ہمیں یہ نظم حیات مرکزیت کی فکر کی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس نظم میں دنیا کے بننے ٹوٹنے اور سنورنے کے عمل کو لکھا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کسی انسان کی وجہ سے نہیں بل کہ یہ فطری عوامل ہیں جو ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ہمیں کوئی بھی ایسی دنیا نہیں ملی جس میں ہمیں اس طرح کی زندگی کے آثار دکھائی دیے ہیں ہم زمین کو ہی زندگی کا مرکز و محور مانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں زمین کے وجود کی زندگی ملی ہے شیرل گلاٹفیلٹی لکھتی ہیں:

> جیسے تاریخی تنقید ایک سیاسی شعور کے تناظر میں ادب اور زبان کا جائزہ لیتی ہے اور مارکسی تنقید پیداوار معاشی طبقات کی روشنی میں ادبی متن کو مرکز مطالعہ بناتی ہیں اسی طرح ماحولیاتی تنقید ادبی مطالعات کے لیے زمین مرکز منہاج اختیار کرتی ہے[۳۹]

مٹی زمین کا ایک اہم جزو ہے جو انسانی جسم سمیت ہر چیز کے لیے ناگزیر ہے۔ ایم یامین کی نظم سپردگی ملاحظہ کیجیے:

سپردگی

اس نے

اپنی سوندھی سوندھی

مٹی گوندھی تھی

اور عجب سرشاری سے

پیار کے چاک پر رکھ دی تھی

میں اپنے دونوں ہاتھوں کی

پوروں میں جاگ اٹھا تھا[۴۰]

اس نظم میں شاعر ایم یامین نے تخلیق کے ایک اور پہلو پر نظر دوڑائی ہے جس سے شاعر کی فلسفیانہ طرز سوچ کی عکاسی ہوتی ہے شاعر مٹی سے حیات کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات بھی اپنے آپ میں حیات مرکزیت کی ذیل میں آتی ہے۔ اس نظم میں شاعر ایم یامین تخلیق کا وہ پہلو اجاگر کر رہے ہیں جس میں زندگی کی تخلیق کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔ جس میں وہ مٹی سے زندگی پیدا کرنے کی بات کرتے ہیں۔ جو بشر مرکزیت کے خلاف ایک بیانیہ ہے۔ ان کی شاعری کا یہ انداز ان کی اس نظم کو حیات مرکزیت کے دائرہ اختیار میں لے جاتا ہے۔ جہاں زندگی کی اساس مٹی کو قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ زندگی کے لیے پانی بھی اسی اس کی نوعیت کا حاصل ہے یہاں پر یامین نے کمال مہارت کے ساتھ پانی اور مٹی کو ملا کر ایک وجود کی تخلیق کی بات کی ہے جو حیات مرکزیت کی ذیل میں آتی ہے۔ حیات و ممات فطرت کے مظاہر میں سے ہیں ان میں سے ہر دو صورتوں میں فطرت ہی کی جیت ہوتی ہے۔ فطرت ہمیشہ ان دو صورتوں میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ حیات و، ممات کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی، ہر موت کی ایک زندگی ہوتی ہے۔ زندگی کا ایک تسلسل ہوتا ہے زندگی کا یہ تسلسل ہر حال میں اپنی تاریخ رکھتا ہے۔ زندگی سے موت کا سفر اگرچہ دردناک ہوتا ہے مگر زندگی کی کٹھن گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے موت کے اس درد کو بھلا دینے میں بھلائی ہوتی ہے۔ کچھ پل کی تکلیف کے لیے ایک شاندار ماضی اور تاریخی تسلسل کو بھلا دینا دانش مندی نہیں ہوتی۔ زندگی دراصل ممات و حیات کے تسلسل کا نام ہے۔ زندگی کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ ہر ایک زندگی کا ایک تاریخی تسلسل ہوتا ہے جس کو شاعر ایم یامین کی نظم چوب خشک میں بیان کیا گیا ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

چوب خشک

رات کی خنکی میں ترے آنسو کتنے گرم ہیں

یہ بے کار کی مایوسی کس کام کی

دیکھ! ہرا بھرا جنگل تری تاریخ ہے

جو تیری رنگ بہ رنگ داستانوں سے بھری ہوئی ہے

چھاؤں بھرا درخت تیرا ماضی ہے

اور اس پر۔۔۔۔ چڑیوں کے وہ گھونسلے۔۔۔۔ اور گیت

یہ سب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا لیکن پھر بھی آسمانی یاد میں محفوظ ہے

بعض حشرات اور خطرات تیری موت کا سبب بن سکتے تھے

عمر فنا اور بقا کی یہ جنگ تو نے اب تک نہیں ہاری

مستقبل ترے بدن میں چھپ کر بیٹھا ہے

کشتی، کرسی، میزیں، الماریاں، اور آرام دہ پلنگ

مرد، بچے، عورتیں اور نئی محبت سے مہکتے پریمی جوڑے

لیکن کیا اچھا ہو اگر ایک بانسری بھی تجھ میں کہیں پڑی ہو

اور وہ سُر جو ابھی ظہور میں نہیں آئے

لیکن میں نے

تیرے اندر اک تابوت چھپا دیکھا ہے

جس پر دیمک کی ایک لکیر

ٹھہر ٹھہر کر کچھ سوچتی جاتی ہے [۴۰]

یہ نظم کئی حوالوں سے حیات مرکزیت کے لیے موزوں ترین فن پارہ ہے۔ جس میں شاعر نے زندگی کے تسلسل، تاریخ اور فلسفے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شاعر نے ایک ایسی ماحولیاتی فطری چیز کو موضوع بنایا ہے جو زندگی کا ایک تاریخی تسلسل رکھتی ہے ۔ جس میں ایک سوکھے ہوئے تنے کی بات کی گئی ہے۔ جو اپنی زندگی کے ختم ہونے پر بہت زیادہ پریشانی میں مبتلا ہے۔ مگر شاعر ایم یامین اس درخت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ زندگی تو آنی جانی چیز ہے اس کے لیے پریشان ہونا دانش مندی نہیں ہے۔ یہ مایوسی بے

کار ہے کیوں کہ تمھاری ایک تاریخی حقیقت ہے۔ تمھارے خاندان کی ایک تاریخ ہے اور ایک تاریخی تسلسل ہے تمھیں اس کا پاس ہونا چاہیے۔ اس سے آگے چل کر شاعر ایم یامین فطری ماحول کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم پر بہت سے پرندوں کا آشیانہ ہوا کرتا تھا۔ تمھاری ذات اور تمھارے جنگل کی بھی ایک تاریخ ہے جو شاید دوبارہ لوٹ کر تو نہیں آئے گا مگر وہ سب کہیں نہ کہیں فطرت کے کسی نہ کسی کونے میں محفوظ ہے۔ بہت سے حشرات ایسے بھی تھے جو تمھاری موت کا سبب ہو سکتے تھے۔ مگر تم ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑے رہے۔ تم نے زندگی کی وہ جنگ نہیں ہاری تم اب بھی ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہو۔ تم اپنی بقا کی جنگ اب تک لڑ رہے ہو تمھیں کوئی بھی شکست نہیں دے پایا۔ تم جنگ جیتے نہیں تو ہار بھی تمھارا مقدر نہیں بنی۔ نہ جانے کتنے جسموں کو تمھارے جسم سے زندگی عطا ہو گی۔ یعنی موت بھی تم پر اپنے اثرات نہیں دکھا سکتی۔ نہ جانے کیا کیا چیز تمہارے اندر سے تخلیق ہو گی جو بہت سوں کے لیے راحت کا سامان اور آسانی پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ یہاں بھی زندگی کے تاریخی تسلسل اور زندگی کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کو بیان کیا گیا ہے۔ فطری انداز میں تمام کی تمام چیزیں ایک دوسرے کی سہولت کار معاون اور ممد و ہیں۔ ہر چیز اپنی بقا کی خاطر دوسری چیز کا سہارا لیتی ہے جو بالکل فطری ہے جو حیات مرکزیت پر دلالت کرتا ہے۔

IV غزل میں حیات مرکزیت:

آزاد کشمیر میں تخلیق کی جانے والی اردو غزل کافی حد تک جدید موضوعات کو زیر بحث لاتی ہے۔ ماحولیات کے حوالے سے آزاد کشمیر کی غزل میں بہت زیادہ امکانات موجود ہیں جہاں۔ آزاد کشمیر کی نظم میں یہ موضوع بے ساختگی کے ساتھ برتے گئے ہیں وہیں پر غزل میں بھی ان موضوعات پر خوب شعر گوئی ہوئی ہے۔ آزاد کشمیر کی غزل میں حیات مرکزیت کے موضوع پر اشعار کے نمونے ملتے ہیں جو ماحولیاتی تنقید کے لحاظ سے کافی خوش آئند بات ہے۔ اس حوالے سے آزاد کشمیر کے شعرا کی غزل کافی زرخیز ثابت ہوئی ہے جس میں ان موضوعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

نام نہاد تہذیب و ثقافت مسائل کی جڑ ہے جس نے انسان کو اس زعم میں مبتلا کر رکھا ہے کہ یہ زمین اور یہ کائنات صرف اور صرف اس کی آسانی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ہر ایک چیز کا واحد مقصد انسان کو فائدہ پہنچانا ہے۔ باقی وہ تمام چیزیں جو انسان کے گرد و پیش میں موجود ہیں ان کی کوئی ہستی ہے اور نہ ہی کوئی ان کی وقعت ہے۔ یہ

تمام چیزیں انسان کی سہولت کے لیے ہیں۔ یہ انسان کی سہولت کار ہیں۔ انسان کا یہ زعم اس کو ظالم بناتا ہے۔ مگر اس زعم کو کم کرنا اور اس کے خلاف آواز بلند کرنا حیات مرکزیت کا فرض ہے۔ آزاد کشمیر کے شاعر زاہد کلیم کا ایک شعر ملاحظہ کریں:

زباں، تہذیب، رنگ اور نسل و قومیت کے فتنوں کو

بہا کر ساتھ لے جائے جو، وہ آب رواں میں ہوں[۴۱]

یہ شعر تخلیق کرنے کے لیے جہاں پر بہت زیادہ مشاہدہ اور مطالعہ ضروری ہے وہیں پر انسان کے اندر بے حد بے باکی اور بے خوفی کا ہونا بھی لازمی ہے۔ ایسا اس لیے کہ اپنی زبان، تہذیب و ثقافت رنگ و نسل اور قومیت کے خلاف آواز اٹھانا عالی ہمتی کا تقاضا کرتی ہے۔ شاعر زاہد کلیم نے کمال ہنر مندی کے ساتھ اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی برائیوں کو نشانہ بنایا ہے۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو ابتدائی مرحلے میں تو انسانوں کی تقسیم کرتی ہیں اور آگے چل کر ماحولیاتی عناصر کے درمیان نفرت پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ان چیزوں سے متنفر دکھائی دیتے ہیں۔ حیات مرکزیت کسی بھی جگہ پر کسی ایک ماحولیاتی عنصر سے نفرت کے خلاف ہے چاہے وہ نفرت کسی نوع کے افراد کے درمیان ہو یا کسی دوسری نوع کے افراد سے ہو۔

قدیم ادبیات کی روایت میں زمین کو ماں کا درجہ دیا جاتا ہے بہت سے لوگ آج بھی زمین کو ماں ہی تصور کرتے ہیں۔ دراصل زمین ہی یہاں پر موجود مخلوقات کی حقیقی ماں کا درجہ رکھتی ہے کیوں کہ اب تک کی تحقیق کے مطابق انسان کسی بھی ایسے سیارے کو ڈھونڈنے میں ناکام ہی رہا ہے جس پر انسان اس آزادی کے ساتھ رہ سکتا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ زمین ہمارے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہے کیوں کہ ہم اس کے بدن سے پھوٹ کر اس کی گود میں پل رہے ہیں۔ زمین کو ماں کا درجہ دینا درحقیقت حیات مرکزیت ہے کیوں کہ حیات مرکزیت ارض مرکزیت کی دوسری شکل ہے۔ زندگی کے لیے ساز گار ترین خطہ زمین کو قرار دیا جاتا ہے دراصل زندگی کے لیے ساز گار ترین خطہ زمیں ہی ہے سید قاسم سیلانی لکھتے ہیں:

زمیں ساری زمیں اپنی زمیں ہے

یہ ماں اپنی ہے بیگانی نہیں ہے

یہ سب چہرے ہیں میرے دیکھے بھالے

یہ دنیا مجھ سے انجانی نہیں ہے [۴۲]

سید قاسم سیلانی کے یہ اشعار دراصل ارض مرکزیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جن میں زمین کو ماں کا درجہ دیا گیا ہے اور اس پر بسنے والی ہر چیز کو دیکھی بھالی کہا گیا ہے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ شاعر نے ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے ساتھ زمین کو ماں قرار دیا اور ماں کے بطن سے پھوٹنے والی ہر چیز کے بارے میں انسان کو علم ہوتا ہے اس شعر میں مہارت کے ساتھ ہی حیات مرکزیت اور ارض مرکزیت کی بات کی گئی ہے۔ زندگی تاریخی تسلسل کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ کبھی ایک شکل میں رونما ہوتی ہے تو کبھی دوسری شکل میں۔ حیات و ممات کا یہ کھیل نہ جانے کب سے کھیلا جارہا ہے۔ معلوم نہیں کب تک کھیلا جائے گا مگر یہ بات توطشت از بام ہے کہ زندگی کے اس سلسلے نے نہ جانے کتنے جانداروں کو جاں بر کیا اور کتنے جانداروں کو صفحہ ہستی سے نابود کر دیا ہے۔ اس سارے عمل میں حیات کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے زندگی اور کرہ ارض کی ہی مرکزیت، حیات مرکزیت کہلاتی ہے۔ شفیق راجا کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کریں:

دائرہ در دائرہ ہے زندگی کا سلسلہ

ہے حباب اندر حباب اک آگہی کا سلسلہ

ایک انساں دوسرے انساں سے ہو ممتاز کیوں

ایک آدم سے چلا ہے آدمی کا سلسلہ [۴۳]

یہ شعر شاعر کی فطرت پر گہری نظر کا رد عمل معلوم ہوتے ہیں پہلے شعر میں تو شاعر فلسفہ زیست کو اپنا موضوع بناتا ہے جب کہ دوسرے شعر میں شاعر نے انسان پر موجود انسان کے تسلط کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ اس شعر میں تو شاعر نے انسانی سماج کی نام نہاد تہذیب و ثقافت پر کڑی تنقید کی ہے جس پر شاعر داد و تحسین کے حقدار ہیں۔ شاعر کا انسانی سماج کی بنیادوں پر یہ سوال اٹھانا کہ جب ہم سب ایک جیسے ہی انسان ہے تو ہمارے درمیان یہ درجہ بندیاں کیوں ہیں؟ ہم میں سے ہیں چند لوگ ہم سے زیادہ ممتاز کیوں ہیں؟ ان سوالات کے جوابات

نام نہاد تہذیب کے پاس موجود نہیں کیوں کہ اس تہذیب نے ہر کمزور پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کی ہے۔ حیات مرکزیت ان تمام عوامل کی مخالفت کرتے ہوئے ہر ایک معاشرتی عنصر کو برابری کے حقوق دینے پر مصر ہے۔

زمین اپنے بدن میں کسی بھی چیز کو محفوظ کرنے کے بعد اس کو زندگی عطا کرتی ہے۔ گویا مٹی کا کردار رحم مادر والا ہی ہے جس میں کسی بھی چیز کو زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ زمین بھی اپنے تمام رہنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ اس زمین پر موجود کوئی بھی چیز بے فائدہ یا فضول نہیں ہے۔ بل کہ ہر چیز کی اپنی ضرورت و اہمیت ہے۔ اس موضوع پر شفیق راجا کا شعر ملاحظہ کریں:

مٹی ہے تو گلشن کے لیے رحم کی مانند

پتھر ہے سو یاقوت بنانے کے لیے ہے [۴۴]

اس شعر میں شفیق راجا نے فطرت کی خوب صورتی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زمین کی مٹی تو بالکل رحم مادر کی طرح ہے۔ جس میں بہت سی چیزوں کے بیجوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ بہت ساری چیزیں بارآور اور ثمر بار ہوتی ہیں۔ مگر انسان ان تمام چیزوں کو سمجھ کر بھی ان پر عمل پیرا ہونے سے کتراتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر شفیق راجا نے کمال ہنر مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پتھر کو قوت کا منبع قرار دیا ہے۔ یعنی زمین پر موجود کوئی بھی چیز فضول نہیں ہے۔ ہر ایک چیز کا ایک خاص مقصد ہے۔ کوئی بھی چیز بغیر مقصد کے پیدا نہیں کی گئی۔ ہر چیز کی تخلیق کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز ہے۔ یہی چیز اس کو حیات مرکزیت کے دائرہ اختیار میں داخل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ہر ایک چیز کا اس انداز سے بیان حیات مرکزیت پر دلالت کرتا ہے کیوں کہ اس میں زمین کو مرکزیت کا درجہ دیا گیا ہے جس کو ہم حیات مرکزیت کہتے ہیں۔

اس کرہ ارضی پر فطرت زندگی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ زندگی کسی درخت یا کسی بھی جاندار کی ہو سکتی ہے۔ زندگی بہر حال زندگی ہے جو کسی بھی شکل میں وقوع پذیر ہو ماحولیاتی تنقید ہر زندگی پر اپنا موقف رکھتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید ہر جاندار کو برابری کا درجہ دیتے ہوئے کسی بھی ایک جاندار کو کسی دوسرے جاندار پر فوقیت نہیں دیتی۔ بل کہ تمام جانداروں کو برابری کی سطح پر دیکھتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید کی سوچ اور یہی نظریہ اس کو باقی تنقیدی نظریات سے جدا بناتا ہے۔ ہر ایک زندگی کی ایک اہمیت ہے جسے کوئی بھی جھٹلانے کی سکت نہیں رکھتا۔ زندگی کے اس بحر بے کنار میں کسی ایک نوع یا کسی ایک فرد کی کوئی حیثیت نہیں۔ بل کہ یہ تمام انواع اور افراد مل

کر زندگی کی تعبیر و تشریح کرتے ہیں۔ زندگی کے انفرادی خیال نے بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے۔ شاعر زندگی کے انفرادی خیال سے پوری طرح اختلاف رکھتے ہیں شفیق راجا کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

بیج ہوں مٹی کی تاریکی میں ہوں بویا ہوا

ہوں فقط قطرہ مرا ساگر میں ہونا کیا ہوا[۴۵]

شفیق راجا نے ان تمام نظریات اور تصورات کی نفی کی ہے جو کسی ایک نوع کے ایک فرد یا نوع کی بقیہ انواع بالادستی کی بات کرتے ہوں۔ شاعر شفیق راجا کا یہ شعر دراصل زندگی کی حقیقت اور افادیت کے تصور پر بات کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس شعر میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ زندگی زمین کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور اس بحر بے کنارِ حیات میں ہر ایک فرد کی وہی حیثیت ہے جو سمندر میں قطرے کی ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ سمندر بجا طور پر بہت وسیع ہے تاہم اس میں موجود فطرت کو ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ فرد کی کوئی حیثیت نہیں ہے یعنی زندگی کے سمندر میں انسان بھی ایک جزو ہے جو فطرت سامنے قطرے کی مصداق ہے۔ جس کی اکیلے وہی حیثیت ہے جو سمندر میں قطرے کی ہے۔ جس کو شاعر شفیق راجا نے بطریق احسن سمجھایا ہے۔

ماحولیاتی تنقید اصل میں انسان کے اس نظریے کا رد عمل ہے جس کے مطابق انسان خدا کا نائب اور باقی تمام جاندار اس کی سہولت اور خدمت کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انسان تمام مخلوق کو خود سے کمتر سمجھنا شروع ہو گیا اور انسان باقی تمام مخلوقات کو اپنی ضرورت کے مطابق صرف کرتا چلا گیا۔ تمام کرہ ارض اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ انسان کے اسی زعم کو شاعر ناز مظفر آبادی نے نرالے اور نئے انداز میں بیان کیا ہے۔ شعر ملاحظہ کریں:

کہا گیا میں زمین پر خدا کا نائب ہوں

اور عمر بھر اسی وہم و گماں میں رکھا گیا[۴۶]

اس شعر میں شاعر کی فطرت کے لیے محبت اور انسان کی جارح مزاجی کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ انسان کی جارحیت کے پیچھے سب سے بڑا کردار مذہبی فرقے ہے جس کے مطابق انسان کو زمین کے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔ ان لامحدود اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان نے زمین کے نظام کو بری طرح سے

متاثر کیا ہے۔ جس سے تمام حیات متاثر ہوئی۔ حیات مرکزیت نظریے کی طرح شاعر نے بھی اس بات کی مخالفت کی ہے کہ انسان دھرتی پر خدا کا نائب ہے شاعر کی نظر میں انسان کی وہی حیثیت ہے جو حیات مرکزیت اس کو عطا کرتی ہے۔ یعنی اس کی باقی مخلوقات سے زیادہ حیثیت نہیں۔ انسان کو سوچنا ہو گا کہ کیسے لامحدود اختیارات کو محدود کیا جاسکے۔ باقی جانداروں کو بھی جینے کا اتنا ہی حق دیا جائے جتنا کہ خود انسان کو جینے کا حق حاصل ہے۔

زندگی سانس کے آنے اور جانے کا نام نہیں بل کہ ایک تسلسل ہے جو کروڑہا برس سے چلا رہا ہے۔ انسان بھی ایک تسلسل کا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ حیات مرکزیت صرف اور صرف زندگی کو معیار سمجھتی ہے۔ آج سے کئی ہزار برس قبل اس زمین پر انسان نہیں تھا۔ تاہم باقی مخلوقات موجود تھیں ہر ایک مخلوق کے آنے سے کئی اور مخلوقات کی آمد ہوئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے مستقبل میں انسان کی ظاہری حالت بدل جائے اور دنیا کسی اور جدید مخلوق کو دیکھے۔ یہ تمام چیزیں موجود ہیں یہی امکان حیات مرکزیت ہے۔ زندگی کسی نوع یا کسی نہ کسی ایک جزو کی موت سے رکتی نہیں بل کہ یہ ہر وقت جاری و ساری رہتی ہے ناز مظفر آبادی اپنے ایک شعر میں لکھتے ہیں:

زندگی جسے کہیے ایک نظام کامل ہے

آتی جاتی سانسوں کو زندگی نہ سمجھا جائے [۶۷]

شاعر کا زندگی کو اس انداز میں دیکھنے کا طریقہ غزل کی روایت میں نیا اور اچھوتا ہے۔ جس میں زندگی کو سانس کے آنے اور موت کو سانس رک جانے پر ہی موقوف نہیں رکھا گیا بل کہ ہر چیز کی زندگی اس وقت تک ہے جب تک کہ آخری جاندار اس دھرتی پر رہتا ہے۔ اس لیے زندگی کا یہ نظریہ جس میں زندگی کو محور و مرکز بنایا جاتا ہے در اصل حیات مرکزیت کی ایک قسم ہے۔ جس کو شاعر ناز مظفر آبادی نے اپنے غزلیہ شعر میں خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حیات مرکزیت دراصل زمین کو اس لیے بھی مرکز مانتی ہے کہ زمین ان تمام جانداروں کی جنم بھومی ہے جو اس پر آباد ہیں۔ سب کے سب جاندار ایک فطری عمل کی بدولت اس دنیا پر وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ کائنات کے ذرے ذرے میں زندگی کی لہر میں پوشیدہ ہے ہر چیز جب تک وجود میں نہیں تھی تو وہ کہیں نہ کہیں اس دھرتی کے وجود میں موجود تھی۔ فطرت کی قدرت کامل نے ہر چیز کو بالترتیب پیدا کیا۔ جمادات سے نباتات کو پیدا کیا نباتات

سے حیوانات کو تخلیق کیا۔ غرض ہر چیز کو ترتیب کے ساتھ تخلیق کیا گیا۔ تخلیق کا جوہر فطرت میں پہلے سے موجود تھا جس کو شاعر احمد عطااللہ نے اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے اشعار ملاحظہ کریں:

پھر اک دن دم بخود حالات سے باہر نکل آیا

تو میں پھونکی ہوئی آیات سے باہر نکل آیا

میں خفتہ بیج تھا میں نیندوں نیند سوتا تھا

زمیں کے اندریں حالات سے باہر نکل آیا[۴۸]

ان اشعار پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر نظریہ ارتقا سے متفق اور متاثر ہیں کیوں کہ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں اور تمام جاندار چیزیں زمین کے اندر بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ایک بیج زمین کے اندر رکھا جاتا ہے۔ جو وقت آنے پر تناور درخت بن جاتا ہے۔ یعنی زمین کے اندر ہی وہ مرکزی کردار ہے کہ جب کوئی چیز نمودار ہونے پر آتی ہے تو پھوٹ کر اپنا اظہار کرتی ہے۔ جس سے وہ دنیا کے سامنے آجاتی ہے۔ شاعر نے اس بات کا اظہار کر کے غزل کے شعر کو اور بھی معتبر کر دیا ہے۔ حیات مرکزیت کے اس موضوع کو شاعر نے پوری سرعت کے ساتھ نہایت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے جو صرف اور صرف احمد عطااللہ کا ہی ملکہ ہے۔

آزاد کشمیر کی غیر مطبوعہ اردو غزل میں بھی حیات مرکزیت کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔ جس طرح آزاد کشمیر کے مختلف رنگوں اپنی شاعری میں رنگارنگی رکھتے ہیں بالکل اسی طرح نو آموز غزل گو شعرا بھی اپنی غزل میں رنگارنگی اور تنوع سے رکھتے ہیں حیات مرکزیت میں شہدائے کشمیر کی بہت سی شاعری کافی اہمیت کی حامل ہے۔ دریاؤں کے رخ کی تبدیلی فطرت کے ساتھ زیادتی ہے آزاد کشمیر میں فطرت کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا جارہا ہے جس کو آزاد کشمیر کے شعرا نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے دریاؤں کے رخ تبدیل کرنے کی وجہ سے شعرائے آزاد کشمیر نے بہت سی شاعری کی جن میں سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

دھرتی کا تقاضہ ہے کہ دھرتی کے خداؤ

دریاؤں کے رستے میں فصیلیں نہ بناؤ[۴۹]

یہ شعر آزاد کشمیر کے نوجوان شاعر اسلم رضا کی تخلیق ہے۔ جس میں انھوں نے انسان کی بالادستی اور فطرت کے خلاف ہونے والی انسانی جارحیت کو نشانہ بنایا ہے۔ یہ شعر اپنے ماحول کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس شعر کو حیات مرکزیت میں ایک مرکزی شعر ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلم رضا خواجہ نے کمال ہنر مندی کے ساتھ انسانی توسیع پسندانہ عزائم کی کھل کر مخالفت کرتے ہوئے فطرت کو محفوظ کرنے کی بات کی ہے۔ یہ شعر بلاشبہ ماحولیات کے حق میں اٹھائی گئی آوازوں میں سے ایک جاندار آواز ہے۔

جنگلی حیات اور بالخصوص درختوں کے حوالے سے آزاد کشمیر کے شاعر احمد آفاق کا ایک منفرد مقام ہے۔ ماحولیات کے بچاؤ کے لیے ان کی شاعری بہت زیادہ اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں درخت ایک انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کو نہ صرف اپنے کٹنے کا دکھ ہوتا ہے بل کہ وہ درخت سسکیاں اور آہیں بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ احمد آفاق کی ایک مسلسل غزل ملاحظہ کیجیے جس کی ردیف "درخت ہیں" ہے:

جو مِرے حمایتی درخت ہیں

گاؤں کے وہ آخری درخت ہیں

شہر میں بڑھا رہے ہو رونقیں

جنگلوں میں ماتمی درخت ہیں

نسل ختم ہونے کی شکایتیں

اور سبھی شکایتی درخت ہیں

تیز دھوپ اور دشت کا سفر

سائبان بس یہی درخت ہیں

کہہ کے یہ چلا دیں سب نے آریاں

گاؤں میں تو اور بھی درخت ہیں

بس یہی ہے دوست قصّہ مُختصر

ہم سبھی کی زندگی درخت ہیں[۵۱]

درج بالا غزل کئی حوالوں سے بہت اہم ہے اس غزل کے مطلعے سے لے کر آخر شعر تک صرف اور صرف درختوں کی بات کی گئی ہے۔ درختوں کے حقوق کا خیال رکھنے کا ذکر کیا گیا درختوں کی کٹائی پر غم وغصے کا اظہار اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شاعر نے درختوں کے غم کو اپنا غم سمجھ لیا ہے۔ یہ بات بین حقیقت ہے کہ درخت اس دھرتی پر زندگی کا ایک لازمی اور بے بدل جزو میں جن سے کسی بھی طور پر منہ نہیں موڑا جاسکتا۔ شاعر احمد آفاق غزل کے آخری شعر میں درختوں کو انسان سمیت ہر ذی روح چیز کی زندگی قرار دے رہے ہیں۔ شاعری کا یہ تجربہ کم یاب ضرور ہے مگر نایاب نہیں ہے۔

حوالہ جات

1- Timothy Clark, The Cambridge Introduction to Literature and the environment P33 2011, York, Cambridge University Press, New

۲-منور احمد قریشی، دہلیزِ شب، اتفاق پرنٹنگ پریس، مظفر آباد، ۲۰۰۰،ص ۲۷

۴-ایضاً ص ۳۱۔۳

۵-ایضا ۹۱

۶۔ایضا۱۲۲۔۱۲۳

07-Timothy Clark, The Cambridge Introduction to Literature and the environment Cambridge University Press, New York,2011,P33

۸۔شفیق راجا،لفظ کا کاجل، طلوع آدب، باغ۲۰۱۸ص ۵۳

۹-ایضاً ۱۰۲

10- Delegates to the First National People of Color Environmental Leadership Summit held on October 24-27, in Washington DC, 1991, file:///C:/Users/POFIT%20Library/Downloads/ej-principles.pdf, Dated. 11-02-2022 Time:10:40

۱۱-کاشف رفیق، اداس رات کا چاند، زربفت پبلی کیشنز،۲۰۰۴، ۱۰۲

12.Greg Garrard, Ecocriticism the New Critical Idiom, Routledge, Abingdon,2004,P149

۱۳۔کاشف رفیق، اداس رات کا چاند، زربفت پبلی کیشنز، ۲۰۰۴،۴۵

14.Edward Abbey, Desert Solitaire A Season in the Wilderness,(Electronic Edition) Rosetta Books LLC, New York,2011, P124-125.

۱۵-واحد اعجاز میر، اوا گون، نواب اینڈ سنز پبلیکیشن راولپنڈی ۲۰۱۵ ،۶۹

۱۶-ایم یامین، دھوپ کا لباس بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲، ۳۱۔۳۲

۱۷-واحد اعجاز میر، اوا گون، نواب اینڈ سنز پبلیکیشن راولپنڈی، ۲۰۱۵ ۱۹۰

۱۸-ایضاً ۴۷

۱۹-ایضاً ۹۲۔ ۹۱

۲۰- ڈاکٹر صابر آفاقی، شہر تمنا، ادبیات پبلشرز، مظفر آباد ۱۹۹۲، ۱۲۶۔۱۲۷ ۔۱۲۸

۲۱-سید قاسم سیلانی، سفر سرائے اور سیلانی، کشمیر کلچرل اکیڈمی، مظفر آباد، ۲۰۱۰، ۳۷

۲۲-شفیق راجا، لفظ کا کاجل، طلوع آدب، باغ ۲۰۱۶،۷۲

۲۳-ایضاً۹۱

۲۴-کاشف رفیق، اداس رات کا چاند، زربفت پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۲۰، ۲۷

۲۶-ناز مظفر آبادی، ہم سخن مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۵، ۳۴

۲۶۔ایضاً ۴۰

۲۷-ایضا ۶۲

۲۸- ایضا

۲۹۔ایضا۸۰

۳۰۔احمد عطا اللہ، ہمیشہ، العصر پبلی کشنز، لاہور ۲۰۱۱ ۶۸

۳۱- ڈاکٹر صابر آفاقی، شہر تمنا، ادبیات پبلشرز، مظفر آباد ۱۹۹۲، ۴۷

۳۲- ایضا ۶۸

۳۳-ایضاً ۸۸

۳۴-ایضاً ۹۱

35- Robert Lanza, MD, with Bob Berman, biocenterism, benbella books, Dellas tx, 2009, 17

۳۶۔ منور احمد قریشی، دہلیزِ شب، اتفاق پرنٹنگ پریس، مظفر آباد، ۲۰۰۰

۳۷۔ ایضاً، ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰

۳۷۔ واحد اعجاز میر، اوا گون، نواب اینڈ سنز پبلیکیشن راولپنڈی 2015 ۲۳۰۔ ۲۳۱

۳۸-شیرل گلاٹ فلٹی، ماحولیاتی تنقید: آغاز وارتقا امکانات، ڈاکٹر اورنگذیب نیازی (مترجم) مشمولہ ماحولیاتی تنقید نظر اور عمل اُردو سائنس بورڈ لاہور ۲۰۱۹ ص ۱۶

۳۹-ایم یامین، دھوپ کا لباس، بی پی ایچ پرنٹرز لاہور ۲۰۱۶ ۳۲

۴۰-ایضاً ۶۵۔ ۶۶

۴۱-زاہد کلیم محراب فکر نیلم پبلیکشن مظفر آباد ۲۰۰۶ ۴۲۱

۴۲-سید قاسم سیلانی، سفر سرائے اور سیلانی کشمیر کلچر اکیڈمی مظفر آباد ۲۰۲۰ ۵۶

۴۳-شفیق راجا لفظ کا کاجل طلوع آدب، باغ ۲۰۱۸، ۵۲

۴۴-ایضاً ۱۱۱

۴۵-ایضاً ۱۴۴

۴۶-ناز مظفر آبادی، ہم سخن مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱۵، ۳۹

۴۷-ایضاً ۱۳۵

۴۸-احمد عطااللہ، ہمیشہ العصر پبلی کیشن، لاہور ۲۰۱۵ ۷۵

۴۹-اسلم رضاخواجہ، بیاض قلمی، مملوکہ، خاور نذیر، مظفر آباد

۵۰- احمد آفاق، بیاض قلمی، مملوکہ، خاور نذیر، مظفر آباد

باب سوم: آزاد کشمیر کی اُردو شاعری میں مقاماتی ماحولیات اور راعیانیت

I مقاماتی ادب:

اصطلاح میں مقاماتی ادب ماحولیاتی تنقید کی ایک اہم ترین اصطلاحات میں سے ایک ہے جس میں کسی مقام کی پیش کش کے ساتھ ساتھ وہاں کی ماحولیاتی پیش کش بھی کی جاتی ہے۔ مقام کے لغوی معنی تحریر کرتے ہوئے شان الحق حقی اپنی کتاب فرہنگ تلفظ میں لکھتے ہیں: (مقام: جگہ ٹھکانہ ٹھہرنے کی جگہ قیام مقام ہل منزل مرحلہ)[1]

مقام کو عام معنوں میں جگہ کے مترادف ہی دیکھا جاتا ہے۔ مقام کسی بھی چیز کے مسکن کو کہا جاتا ہے۔ انسان یا کوئی بھی جاندار جہاں پر رہتا ہے اپنے گرد و پیش سے کافی متاثر ہوتا ہے۔ جس کی جھلک اس کے تمدن میں نظر آتی ہے۔ تمدن تہذیب کے مادی اظہار کو کہا جاتا ہے۔ کسی بھی جاندار پر نظر ڈالی جائے تو وہ اپنے علاقے کے اثرات سے کافی حد تک متاثر ہوتا ہے۔ ہر جاندار کی ظاہری وضع قطع اس کے ماحول کے مطابق ہوتی ہے۔

ایک بکری جو میدانی گرم مرطوب علاقوں میں رہتی ہے اس کے جسم پر بال بہت کم ہوتے ہیں مگر پہاڑی اور ٹھنڈے علاقے میں موجود اسی جنس کے بقیہ جانداروں کے جسم پر بہت گھنے اور لمبے بال ہوتے ہیں۔ گویا انھوں نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اپنے آپ میں تبدیلیاں رونما کر دیں۔ اسی طرح انسان بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک انسان نطق کی نعمت سے مالامال ہے وہ اپنے پاس موجود اس نعمت سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ خود پر بیتے ہوئے حالات اور گرد و پیش میں ہونے والے واقعات کو بھی قلم بند کرتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جو جاندار جس جگہ پر رہتا ہے اسے اپنے گرد و پیش سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ چاہ کر بھی اس جگہ کو بھول نہیں پاتا۔ اس محبت کے پیچھے کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ تاہم ماحولیاتی عوامل کا عمل دخل بقیہ چیزوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے اسی لیے ماحولیاتی تنقید مقاماتی ادب پر بحث کرتی ہے۔

وہ تحریر جس میں انسان اپنے خیالات جذبات اور احساسات کا اظہار کرے ادبی تحریر کہلاتی ہے۔ ایسی تحریر میں انسانی ذہن تصور اور فکر کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ایسی شاعری کو جگہ دی جاتی ہے جس میں کسی بھی علاقے ،شہر، پہاڑ، دریا، میدان، صحرا یا کسی جگہ کا ذکر موجود ہو۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس تحریر

میں ماحولیاتی عوامل کا عمل دخل ہونا بھی لازمی ہے۔ اگر کسی علاقے، جگہ یا ماحولیاتی عنصر کے نام کے ساتھ ساتھ اس کی ماحولیاتی پیش کش بھی موجود ہو مقاماتی کہلاتی ہے۔ ٹموتھی کلارک لکھتی ہیں:

> In this sense the literature is read as itself an experiment in place with the potential to feed into the cultural life of that place, especially in light of the fact that so many of the authors are themselves also engaged with activities of grassroots environmentalism or heritage.[۲]

مقاماتی ادب سے مراد ایسا ادب جو کسی مخصوص علاقے کے مقام یا کسی مخصوص جگہ کے بارے میں ہو۔ ایسے ادب میں عام طور پر کسی شہر وغیرہ کے حوالے سے ادبی پیش کش کی جاتی ہے۔ مقاماتی ادب کے لیے یہ چیز بھی ضروری نہیں ہے کہ اس میں صرف اور صرف کسی شہر کا تذکرہ ہو۔ اس نظریے کے مطابق کسی بھی مخصوص مقام کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں کوئی بھی ماحولیاتی پیش کش موجود ہو سکتی ہے۔ جیسے کسی پہاڑ کا ذکر کرنا تا کہ اس کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اس کی مقاماتی اہمیت بھی ظاہر ہو۔ اس پیش کش میں ماحولیاتی عناصر کا شامل ہونا بھی ضروری ہے۔

مقاماتی ادب کی اصطلاح پہلے سے مختلف ادبی حلقوں کے استعمال میں رہی ہے۔ تاہم ادب کی ترویج و ترقی کے باعث مختلف تنقیدی نظریات کے ساتھ ذیلی تنقیدی نظریات بھی پروان چڑھنے لگے۔ اس اصطلاح کی ابتدائی کڑیاں نارمن پیج اور پیٹر پرسٹن کی مرتبہ کتاب "The Lteratue of Place" سے ملتی ہیں۔ اس کتاب میں مختلف شعرا اور نثر نگاروں کی ایسی تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے جن میں کسی جگہ کے لحاظ سے وہاں کے ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ بعد ازاں اس اصطلاح کو جاس اسمتھ نے اپنی کتاب "The Nature Writing" میں استعمال کیا۔

اگر کسی دریا وغیرہ کا ذکر ہے تو اس میں بھی کسی ماحولیاتی پیش کش کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ یعنی کسی مقام کے بارے میں تخلیق کیا جانے والا ادب جس میں ماحولیاتی پیش کش بھی موجود ہے مقاماتی ادب کہلاتا ہے۔ مقامی اور مقاماتی ادب میں فرق لازمی روا رکھا جانا چاہیے کیوں کہ مقامی ادب میں کسی بھی علاقے کی مقامیت، جغرافیے، اس

کی تہذیب و ثقافت، زبان اور تمدن وغیرہ کو اپنا موضوع بنایا جاتا ہے۔ جب کہ مقامی ادب میں کسی مخصوص علاقے کے مخصوص ماحول اور جغرافیہ کی بات کی جاتی ہے۔ اس میں کسی علاقے کی مقامیت کی بات تو کی جاتی ہے مگر تہذیب و ثقافت کو کسی بھی طور پر اس میں شامل نہیں کیا جاتا۔ بل کہ تہذیب و ثقافت کے برعکس وہاں کی فطری زندگی کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ قاری کسی علاقے کی فطری زندگی کے بارے میں جان سکے اور زیادہ سے زیادہ حظ اٹھا سکے۔

II نظم میں مقاماتی ادب:

مقامات ہماری زمین کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔ مقامات کے ہونے سے ہی دنیا کی پہچان ہے۔ مقام کا نام دے کر ہی اس دنیا کی پہچان ممکن ہوئی ہے۔ اسی لیے شعرا کے ہاں بھی مقامات کے لیے کافی کشش پائی جاتی ہے ۔جس کا اظہار وہ اپنے اپنے انداز میں اپنی شاعری میں کرتے رہتے ہیں۔ کشمیر ایک ایسا مقام ہے جس کی ہر وادی خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہے اور اس کے دریا، جھرنے، پہاڑ اور جھیلیں غرض یہ کہ ہر چیز لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ شعرا بھی ان چیزوں سے متاثر ہو کر ان پر شاعری کرتے ہیں۔ ان جگہوں کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ فطرت کا ذکر کرتے ہوئے ثقافت کا بیان کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم میں ماحولیاتی تنقید کی اصطلاح مقاماتی ادب کو خوب صورت اور نفیس انداز میں بیان کیا گیا ہے جس میں ایک انسان اور اس کے ماحول کا رشتہ اور اس کے مقام کے بارے میں آرا بھی ملتی ہیں ۔اس ضمن میں منور قریشی کی نظم گیت ملاحظہ کریں:

گیت

میں دھرتی کا راج دلارا، محنت کش انسان

میں کھیتوں کا راجا، میں کشمیر کا اک دہقان

مٹی کے ذرے ذرے سے سورج نئے اگاؤں

ہل کی لکیروں سے سارے جگ کی تقدیر بناؤں

ہر موسم میں غلے کے انبار لگاتا جاؤں

میرے دم سے ہرے بھرے ہیں کھیتیاں اور کھلیان

صبح ہوتی ہے، بیت گئی ہے ظلم کی کالی رات

سوچ نئی ہے، دور نیا ہے، نئی ہے ساری بات

سورج میرے گھر لایا ہے روشنی کی سوغات

جاگ اٹھا ہے میرے دیس کا ہر مزدور کسان

میرا پیارا وطن بنے گا جنت کی تصویر!

فولادی بانھوں سے ہو گی اب اس کی تعمیر

محنت کش کے ہاتھ میں ہو گی اب اس کی تقدیر

اپنے اس گلشن کی منزل ہے پاکستان تعمیر [۳]

یہ نظم جہاں کشمیر اور اس کے کسان کے متعلق ہے وہیں پر اس نظم میں دنیا پر موجود سامراجی غلبے کے خلاف آواز بھی بلند ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم میں شاعر منور قریشی ایک محنت کش کسان کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ایک کسان اور کشمیر کا رہنے والا ہوں۔ وہ کسان کے بارے میں مزید بتاتے ہیں کہ اس کے ہونے سے ہیں جہان میں طرح طرح کی خوشی ہے۔ یہ اپنی حالت سے صرف فصلیں نہیں اگاتا بل کہ اس زمین سے ستارے اور سورج پیدا کر دیتا ہے۔ اس نظم میں جہاں کشمیر کی خوب صورتی کی بات ہو رہی ہے وہیں پر دوسری طرف آزاد کشمیر کی ثقافت جھلک بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس نظم میں کشمیر کے موسموں سمیت وہاں کی جبری غلامی کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔

آزاد کشمیر کی اردو نظموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں کے شاعر اپنی شاعری میں اپنے وطن پر ہونے والے مظالم کے خلاف بھی احتجاج کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ منور قریشی لکھتے ہیں کہ اب زیادہ دیر تک غلامی

ہم پر نہیں رہے گی بل کہ ہم بھی بہت جلد آزادی حاصل کر لیں گے۔ ایسی آزادی جس میں تمام ملک آزادی سے ہم کنار ہو جائے گا آخر پر شاعر منور قریشی نے الحاق پاکستان کے عزم کا اعادہ بھی کیا ہے۔

یہ نظم کسان اور اس کے فطرت کے ساتھ موجود رشتے پر بھی نظر دوڑاتی ہے۔ اس نظم میں موسموں کی نیرنگی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہ نظم بھارت کی جانب سے کیے جانے والے جبر کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے اور اس کے ساتھ ساتھ الحاق پاکستان کے عزم کا اعادہ بھی ہے۔ یہ نظم آزاد کشمیر کے ماحولیاتی اور سیاسی عوامل کی بھرپور نمائندہ ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم میں جہاں اس کی تہذیب و ثقافت، ماحولیات اور فطرت کو موضوع بنایا جاتا ہے وہیں پر اس کی غلامی کا نوحہ بھی شعر کی زبان زد عام ہوتا ہے۔ جس میں بھارت کے ناپاک عزائم کے خلاف شدید نفرت اور غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ کوہستان ایک پہاڑی علاقے کو کہا جاتا ہے۔ تاہم ایک علاقے کا نام بھی کوہستان ہے جو پاکستان میں ہے۔ شاعر نے کسان کے کردار کے ساتھ ساتھ علاقے کے ماحول کو بھی نظم میں بیان کر رہی ہیں نظم ملاحظہ کیجیے:

چہرا، چہرا کنول بنا ہے، دھرتی بنی گلاب

محنت کش ہاتھوں نے بنے ہیں کیا کیا پیارے خواب

لگے ہیں رنگیں، رنگیں سپنوں کے میلے ہر سو

بولو اللہ ہو

کوہستان کے باسیوں کے سر پر بھی تاج سجے

ابر کرم کی آمد کے صحرا میں گجر بجے

میدانوں میں جاگی سوندھی مٹی کی خوشبو[۴]

یعنی دہقان ہی وہ انسان ہے جو دھرتی کو فطرت سے قریب سے دیکھتا ہے۔ یہ دھرتی کو پھولوں سے بھر دیتا ہے۔ جس سے ہر ایک چہرہ نکھرا نکھرا معلوم ہوتا ہے۔ دھرتی کے رنگ کسان کی بدولت ہیں جو اپنی طاقت اور قوت زمین پر لگا کر اس سے من چاہے رنگ حاصل کرتا ہے۔ منور قریشی مزید لکھتے ہیں کہ پہاڑوں پر رہنے والے کوہستانی لوگوں پر فطرت مہربان ہوتی ہے۔ فطرت کی مہربانی سے ان کے علاقوں پر ابر کرم کا نزول ہو رہا ہے تمام

لوگ خوش ہیں کہ ان کے سر پر رحمت کی بارش ہو رہی ہے۔ جب بارش زمین اور بالخصوص خشک مٹی پر پڑتی ہے تو اس مٹی سے ایک ایسی موت خوشبو بر آمد ہوتی ہے جس کا سحر انسان پر طاری ہونے لگتا ہے۔ مٹی کی خوشبو کے بارے میں لکھتے ہوئے شاعر فطرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جس سے انسان اور باقی جانداروں پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جس کی معطر خوش بو انسان کے دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔

انسان جس مقام پر ہوتا ہے اس مقام عشق اور محبت تو زندگی کا لازمی جزو ہے۔ انسان جو موت کو قبول کر لیتا ہے مگر اپنے وطن سے دست بردار نہیں ہوتا۔ وطن سے محبت ایمان کا حصہ منور قریشی کی نظم میرا وطن مقاماتی ادب کے حوالے سے ایک اور عمدہ حوالہ ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

میرا وطن

مرا وطن میری جاں ہے یارو، مرے وطن کو سلام پہنچے

ہر ایک وادی، ہر ایک صحرا، ہر ایک بن کو سلام پہنچے

مکاں مکاں کو، گلی گلی کو چمن چمن کو سلام پہنچے

مرے وطن کو سلام پہنچے

جہاں کی گلیاں بہشت جیسی، جہاں کے ذروں میں بھی جہاں ہیں

جہاں پہ چہرے کنول کنول ہیں، جہاں زمینیں بھی آسماں ہیں

جہاں پہ راوی، جہاں پہ جہلم، جہاں پہ سندھ اور جہاں جہاں ہیں

وہاں کی ہر ایک شاخ گل کو، ہر اک کرن کو سلام پہنچے [5]

اس نظم میں شاعر نے اپنے وطن سے محبت اور الفت کا جس شدت سے اظہار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس نظم میں شاعر اپنے وطن کو اپنی جان مال عزت و آبرو سے بڑھ کر سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ میرا وطن تو مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میرے وطن پر سلامتی ہو۔ اللہ تعالی اس وطن کو ہمیشہ تابندہ اور شاد رکھے۔ شاعر اپنے وطن کی ہر ایک چیز کو متوجہ کر کے اس پر سلام بھیجتے ہیں۔ ہر ایک صحرا پر سلام بھیجتے ہیں گویا

شاعر اس مقام کی ہر چیز کو اپنی طرف مخاطب کر کے اپنی محبت اور الفت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اس مقام کی ہر چیز کی حیثیت سب چیزوں سے بہت بڑھ کے ہے۔ یہ مقام جنت سے بھی بڑھ کے خوب صورت ہے۔ وہ منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے زرے زرے میں ایک جہان موجود ہے۔ اس کی زمین جو پہاڑوں پر مشتمل ہے وہ آسمان سے جڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جس سے اس کی بڑائی اور عظمت واضح ہوتی ہے۔ وہ اپنی دھرتی پر بہنے والے دریاؤں کے نام لے کر انھیں مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ میرے دیس میں نیلم، جہلم اور سندھ جیسے دریا بہتے ہیں۔ جن کی موجودگی سے فطرت کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ وہ چناروں کے دیس کشمیر پر سلامتی بھیجتے ہیں جو شاعر کا دیس اور وطن ہے۔ جو شاعر کے لیے عظمت کا استعارہ ہے اس پوری نظم میں شاعر نے مقامات کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی پیش کش بھی کی ہے۔

اب کے سال سرما میں

برف کی نئی چادر

سرزمیں کے سینے پر

پارسال کے مانند

پھر سے ڈال دی تو نے

آسماں بتا مجھ کو

ارض کاشمر پر یوں

کتنا وقت بیتا ہے

سال سال سرما میں

برف کی حسیں چادر

ڈالتا ہے تو اس پر

اور پھر کوئی گولی

آگ اور سیسے سے

اس کو چھید دیتی ہے

اس کو پھاڑ دیتی ہے

پھر زمیں کے سینے سے

سرخ خوں اُبلتا ہے

گرم خوں نکلتا ہے

اور برف کی چادر

خوں سے سرخ ہوتی ہے

آسماں بتا مجھ کو

کتنے سرد سالوں سے

برف اور گولی کا

کھیل یوں ہی چلتا ہے، یوں ہی چلتے رہنا ہے[۶]

پانچ فروری کے روز پاکستان میں یوم یکجہتی کشمیر منایا جاتا ہے۔ یہ دن اس لیے منایا جاتا ہے کہ اس روز کشمیریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ شاعر اس نظم میں موسم سرما سے سوال کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ موسم سرما مجھے یہ بتا کہ تو نے پچھلے سال کی مانند برف کی ایک نئ چادر اپنے اوپر تان لی ہے۔ اور پھر شاعر آسمان سے یہ سوال کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ آسمان تو مجھے بتا کہ کتنے برس سے تو یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کشمیری سرزمین کو کتنا عرصہ ہوا ہے کہ یہ اپنے اوپر برف کی کوئی چادر تان لیتی ہے اور پھر کوئی آ کر اس پر بارود کی برسات کر دیتا ہے۔ جس سے اس

میں موجود شہیدوں کے خون سے پھر زمین رنگ دی جاتی ہے۔ زمین لہو لہان ہو جاتی ہے برف کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ شاعر سوال کرتے ہوئے بھی پائے جاتے ہیں کہ وہ آسمان سے پوچھتے ہیں کہ آسمان مجھے بتا کہ تو کتنے عرصے سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ گولی اور انسان کے خون کا تعلق اتنا پرانا ہے کتنے عرصے سے کشمیریوں پر یہ ظلم اور جبر ہوتا آ رہا ہے؟ کتنے عرصے سے یوں ہی دریا خون سے رنگے جا رہے ہیں؟ کتنے نہتے کشمیریوں کا خون بہ چکا ہے؟ اور یہ سلسلہ کب تک قائم رہے گا؟ آزاد کشمیر کی اردو نظم میں مقاماتی ادب کو کافی پذیرائی دی گئی ہے۔ آزاد کشمیر کے مقاماتی ادب میں ماحولیاتی پیش کش کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ درج بالا نظم میں شاعر جاوید الحسن جاوید نے نہایت عمدگی کے ساتھ آزاد کشمیر کے حالات اور واقعات کی ترجمانی کی ہے۔ جس میں کشمیر کے رہنے والوں کی سوچ اور نظریہ کا پرچار بھی ملتا ہے اور کشمیر کے نام پر ہونے والی قربانیوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

کشمیر کی اردو نظم میں جہاں پر کشمیر کے مقاماتی ادب کے بارے میں بات کرتے ہوئے کشمیر پر ہونے والے مظالم کے خلاف مزاحمت کی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح دنیا بھر کے مظلوموں کے حق میں بھی آواز بلند کی جاتی ہے۔مقاماتی ادب کی ذیل میں تخلیق ہونے والے ادب کا کسی خاص علاقے کے بارے میں ہونا ضروری ہے۔ جاوید الحسن جاوید کی نظم کوئی بولتا نہیں مقاماتی ادب کی ذہن میں تحریر ہونے والی شاندار نظموں میں سے ایک ہے نظم ملاحظہ کیجیے:

کوئی بولتا نہیں

میں نے کہا کہ سوچ کے طاہر کہاں تھے تم

اُس نے کہا کہ امن کی دنیاؤں کی ہوس

مجھ کو اڑا کے لے گئی اپنے دیار سے

میں نے کہا کہ لوٹ کے آئے ہو کس طرح

کچھ تو سناؤ امن کی دنیا کا ماجرا

اُس نے کہا کہ ایک درندوں کا بادشاہ!

میں نے کہا کہ کون درندوں کا بادشاہ؟

اُس نے کہا کہ جس کی حکومت ہے طرف

کابل سے لے کے دجلہ کنارے جہاں گیا

پایا فقط اسی کے درندوں کی فوج کو

میں نے کہا کہ کس کی حکومت کہاں کی فوج؟

اس نے کہا کہ تیل کے چشمے رواں رہیں

جس کے لیے لہو سے زمیں سینچتے رہے

وہ نوچتے رہے بھی جسموں کو جان کو

اُس کے لیے ہزار عذابوں کو لوگ سب

جھیلیں گے یوں ہی اور یونہی جھیلتے رہے

میں نے کہا کہ کیا ہوا آخر مجھے بتا

کیا ظلم کے خلاف کوئی بولتا نہیں؟

اُس نے کہا کہ خوف دلوں میں اتر گیا

دیکھا تو میری سوچ کا طائر نہیں تھا واں

اک شاخ سر بریدہ تھی میں تھا وہاں پہ بس[۷]

اس نظم میں شاعر جاوید الحسن جاوید نے تخیلاتی منظر کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک روز میرے تصورات اور تخیلات کے پرندے غائب رہے۔ جب وہ میرے سامنے آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں تھے؟ تو انھوں نے بتایا کہ وہ دنیا میں اس کی تلاش میں نکل گئے تھے جہاں پر سکون ہی سکون ہو اور وہ پُر آشوب زندگی سے نکل کر اس کی جگہ پر ٹھہر سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ اب دنیا کے

ان کی کیاصورت حال ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ درندوں کا بادشاہ ہے جس نے پوری دنیا کو یرغمال بنار کھا ہے۔ شاعر کے دریافت کرنے پر وہ درندوں کا بادشاہ کون ہے وہ بتاتے ہیں کہ اس کی حکومت ہر طرف ہے چاروں طرف اس کی فوج کے ہی پہرے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ انھوں نے جہاں بھی دیکھا درندوں کی اسی فوج کو دیکھا جس نے تمام عالم کو جہنم بنار کھا ہے۔ کابل سے لے کر دجلہ کنارے تک بس اسی کے سپاہی منڈلا رہے تھے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ یہ تیل حاصل کرنے کے لیے پوری دنیا پر قابض ہیں۔ ان کا مقصد محض وسائل لوٹ کر اپنی تجوریاں بھرنا ہے۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ وہ انسانوں پر بم گرا سکتے ہیں جسموں کو نوچ سکتے ہیں۔ ان کا مقصد یہی ہے کہ تیل کی بندش نہ ہو۔ ان کی تجوریاں بھرتی رہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا کوئی ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا؟ تو انھوں نے کہا کہ اب کوئی ظلم کے خلاف نہیں بولتا کیوں کہ سب کے سب خوف زدہ ہیں لوگوں کے دلوں میں اس کا ڈر گھر کر چکا ہے اس لیے ہی خاموش ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ جب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں کوئی پرندہ نہیں تھا ایک پرانی سی شاخ تھی اور میں تھا۔ اس نظم میں شاعر نے علامتی انداز میں مقامات کو سامنے رکھ کر بات کی ہے کہ امریکہ غریب ممالک کے وسائل لوٹ کر لے جاتا ہے۔ اس کا سرمایہ دار طبقہ یہ چوریاں کر کے دنیا بھر میں امیر ترین بنا ہوا ہے۔ ماحولیاتی تنقید ویسے بھی انسان کے اس غیر فطری عمل کی مخالف رہی ہے۔ دوسری طرف مقاماتی ادب میں انسانی اجارہ داری، لالچ اور ہوس کی داستان اس سے بہتر انداز میں نہیں بیان کی جاسکتی۔

جھیل ڈل کو آزاد کشمیر کی اردو نظم حسرت کے استعارے کے طور پر برتا گیا ہے۔ یہ مقام سرینگر کے دامن میں موجود ہے جہاں سے دریائے جہلم گزر کر پاکستان میں آتا ہے۔ جھیل ڈل کو آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں ایک وقیع استعارے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ جھیل اپنے آپ میں محبت وحسرت و یاس کا پیغام ہے۔ تاہم بہت سے لوگوں کے لیے امید کی کرن بھی ہے بہت سے لوگ اس کی وجہ سے پر امید ہیں کہ انھیں یہ مقام دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس جھیل کا ذکر کرتے ہوئے باقی مقامات کی طرح شاعر غم و غصے کے ساتھ بھارت کے مظالم کی بات بھی کرتے ہیں جیسے جاوید الحسن کی نظم ڈل کے کنارے پر سرخ پھول ہے نظم ملاحظہ کریں:

ڈل کے کنارے پہ سُرخ پھول

صحن چمن لہو ہے گلستاں لہو لہو

کس شوق میں ہے رُوئے نگاراں لہو لہو

دیکھے ہیں تم نے ڈل کے کنارے پہ سُرخ پھول

دیکھو انھیں یہ رُوئے شہیداں لہو لہو

مٹی میں کس لہو کی ہے خوشبو رچی بسی

خاک وطن میں کس کے ہیں ارماں لہو لہو

جہلم جو ایک درد کا دریا ہے موجزن

کیوں بہہ رہا ہے خون میں غلطاں لہو لہو

اک صورت نمو ہے مرے خاک و خون میں

اک نور کی خبر ہیں یہ گلیاں لہو لہو

لب ہائے احمریں پہ فقط لا الہ کی گونج

جنت کو چومتی ہیں یہ مژگاں لہو لہو

اے ارضِ کاشمر ترے دیوار و در کی خیر

ماتھے پہ تیرے خون کی افشاں لہو لہو

سب کشتگاں ہیں ایک اکیلا نہیں کوئی

ہم دردمند شوق ہیں یکساں لہو لہو[۸]

British nature writing wears its title with some anxiety and discomfort then, aware of the danger of seeming to endorse a

separation of the affairs of 'Nature' from the affairs of the country, even the world, at large.[۹]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر میں ہی نہیں بل کہ دنیا بھر کے مقاماتی ادب میں فطرت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس نظم میں موجود ردیف "لہو لہو "ہے جس سے کشمیر کے قرب کی داستان ظاہر ہوتی ہے۔ وہاں پر رہنے والے لوگوں کے ساتھ ہونے والے مظالم اور ان کی قربانیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اس نظم میں شاعر نے شدت کرب کے ساتھ ڈل کے کنارے پر کھلنے والے پھولوں کی بات کی ہے۔ ہندوستان نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کو تقویت دینے کے لیے بہت سے کشمیریوں کو شہید کر دیا ہے۔ آزادی کے حصول کی خاطر اپنی جان قربان کر دینے والے شہیدوں کو خراج عقیدت اور وہاں بسنے والے بہنے والے دریائے جہلم کو خون سے بھری ہوئی ندیاں کہنا شاعر کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔

علاوہ ازیں مقاماتی ادب ہر اس مصنف کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو فطرت اور فطری عناصر کے قریب ترین ہو یا ان کے حق میں آواز بلند کرتا ہو۔ یہ نظم دراصل کشمیر کا نوحہ ہے جس میں اس پر لگی پابندیوں اور پون صدی کے لگ بھگ اسیروں کی رہائی کے لیے پیغام اور دعا ہے ۔ کشمیر کی تاریخ کشت و خون میں نہائی ہوئی ہے۔جس میں جا بجا قربانیاں ہیں قربانیاں ہیں۔ ماحولیاتی تنقید ماحول کے کسی بھی فرد یعنی کسی بھی ماحولیاتی عنصر پر ہونے والے مظالم کے خلاف برابر احتجاج کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جس میں کسی بھی ماحولیاتی عنصر کے ساتھ غیر فطری انداز میں زیادتی ہو رہی ہو۔

آزاد کشمیر کی خوب صورت اور فلک بوس چوٹیاں اور ان پر بنے میدان ہر ایک شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ فطرت بے نظیر ہے جہاں یہ نظارے ایک انسان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتے ہیں تو دوسری طرف انسان کی طبیعت کو چند ہی لمحات میں سنوار دیتے ہیں۔ انسان کو گرد و پیش میں پھیلی ہوئی فطرت سے ویسے ہی کافی رغبت ہے کیوں کہ انسان ہر وقت فطری انداز میں فطرت سے قریب ہو کر رہنا چاہتا ہے۔ انسان بھی اس فطرت کا حصہ ہے۔ وہ اسی فطرت میں جینا اور مرنا چاہتا ہے۔ آزاد کشمیر کے شاعر ڈاکٹر افتخار مغل کی نظم کوہ گنگا پر ایک شام ایک شاعر اور فطرت کے حسین وصال کا منہ بولتا ثبوت ہے نظم ملاحظہ کریں:

کوہ گنگا پر ایک شام

عروجِ سر زمینِ پونچھ ہے گنگا ترا دامن

تری آغوش حسن و شوخی و تزئین کا مسکن

ترا ہر ایک ذرہ مظہرِ نورِ لطافت ہے

ترا ہر ایک منظر، ہر ادا عکاسِ فطرت ہے

ترا سرمایہ حسن و تمکنت کا ہے امیں گنگا

سراپا نازش و ناز آفرین و ناز نیں گنگا

بہاریں تیرے ہی مشّاق ہاتھوں میں سنورتی ہیں

تری ہر تربیت گہ میں ادائیں بھی نکھرتی ہیں

بہاریں تربیت پاتی ہیں تیری رہگزاروں میں

ہوائیں سیکھتی ہیں رقص تیرے سبزہ زاروں میں

ترے سبزے کی پتی شہپرِ سرخاب سے بڑھ کر

ترا فرشِ زمیں ہے اطلس و کمخواب سے بڑھ کر

ترے رخ پر نگاہِ شوق سورج کی مچلتی ہے

تو شرما کر ترے برفاب کی چاندی پگھلتی ہے

ترے رنگوں کا بھی گویا یہ اک طرزِ تکلم ہے

تری خوشبوؤں کا بھی ایک انداز تبسم ہے

ترے نازش کدے میں زیست جس دم مسکراتی ہے

تو ساری کائنات اس وقت جیسے جھوم جاتی ہے

ازل سے کیا تری شامیں بتا ایسی ہی ہوتی ہیں

بتا کیا تجھ میں ہر شب ایسی خوشیاں آ کے سوتی ہیں

بتا مجھ کو ترا دامن پری زادوں کا مسکن ہے

بتا کیا تیرے سبزہ زار ہی کا نام ایمن ہے

وہ چرواہیں جو دن بھر اپنے ریوڑ کو چراتی ہیں

بوقتِ شام آخر زیرِ لب کیا گنگناتی ہیں

بتا گنگا کہ جب سورج افق میں ڈوب جاتا ہے

تو تیرا ذرہ ذرہ کیوں شفق میں ڈوب جاتا ہے

بتا تو قطعۂ ارضی ہے یا خوابوں کی دنیا ہے

تو نکہت زار ہے یا پھر کوئی رنگوں کی دنیا ہے

کبھی پہلے بھی کیا تجھ کو کسی شاعر نے دیکھا ہے

کسی عاشق نے دیکھا ہے، کسی مضطر نے دیکھا ہے

کسی نقاش نے دیکھا ہے تیری شام کا منظر

بہ الفاظِ دگر سیلِ مئے گلفام کا منظر

مرا جی چاہتا ہے کہ میں بس تجھ میں ہی کھو جاؤں

تمھاری مخملیں آغوش میں سر رکھ کے سو جاؤں [10]

It reads representations of place in the New Nature Writing as relational, even at times as cosmopolitan, in the sense that they explore networks of subnational and regional spaces."

یہ نظم ایک شاعر کے جمالیاتی حسن کی انتہا ہے۔ جس میں وہ فطرت سے ایسے انداز میں محو گفت گو ہے کہ جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کو رومان کا کوئی شعر سنا رہا ہے۔ اس نظم میں ڈاکٹر افتخار مغل کہتے ہیں کہ گنگا چوٹی تیری وجہ سے ہی پونچھ کی سرزمین کو عزت و ناموس ہے۔ تمھارا ذرہ ذرہ اس اس قدر لطیف اور پر نور ہے کہ فطرت کے حسین شاہکاروں میں سے ایک شاہکار معلوم ہوتی ہے۔ تیری وجہ سے گنگا چوٹی اور وادی کی شان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کے سبھی رنگ تجھ سے ادھار لیے گئے ہیں چلنے والی ہوائیں، پھوٹنے والے چشمے یہ سب اپنی مثال آپ ہیں۔

جب تجھ پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو گویا برف شرما کر پگھلنے لگتی ہے۔ برف کے پگھلنے کو شرم و حیا سے جوڑنا اور اس طرح فطرت کی منظر کشی کرنا کہ جس سے ماحولیاتی عوامل اور عناصر کی تصویر کشی مقاماتی ادب کی اعلی ترین پیش کش ہے۔ نظم میں آگے چل کر شاعر راعی لڑکی کی بھی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ گیت جو وہ زیر لب گنگناتی ہے وہ گیت تو گنگا چوٹی ہی سمجھ سکتی ہے۔ آخر پر شاعر پوچھتے ہیں تجھ پر یہ جو رنگوں کی بارشیں ہو رہی ہیں ان کو کسی شاعر نے نہیں دیکھا؟ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمھاری مخملی آغوش میں سر رکھ کر سو جاؤں۔ یہ سب جذبات ایک انسان کے اپنی محبوبہ کے لیے ہی ہو سکتے ہیں۔

یہ بات بھی حقیقت ہے کہ زمین انسان کی سب سے پہلی محبت ہے۔ فطرت ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے اسے کسی باہری طاقت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ وقت اور موقع محل پر انسان سے خود ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم ماحولیاتی ادب میں اپنا الگ اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ جس میں ایک شاعر کا انداز بیان نہایت دلکش اور فطری ہے کہ انسان کو یہ سب پڑھنے کے بعد فطرت کے حسن سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس انداز میں شاعر کی شعری عظمت اور رفعت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس نظم میں جہاں شاعر کی شاعری عظمت معلوم ہوتی ہے وہیں پر شاعر کی زیرک نظری

اور مشاہدے کے گہرے پن کا احساس بھی ہوتا ہے جو ایک عام انسان کا فطرت کے لیے ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد سے ملحق علاقہ جو سیاحوں اور مقامی افراد کو اپنے سحر میں جھکڑے رکھتا ہے۔ اس کی خوب صورتی یہ ہے کہ اس اونچے مقام پر تا حد نگاہ کشادہ میدان نظر آتے ہیں جو سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ مظفر آباد اور اس کے گرد و پیش کے علاقے کے لوگوں کے قریب ترین سیاحتی مقام کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ علاقہ اپنی خوب صورتی اور بدلتے ہوئے موسم کے لحاظ اپنی مثال آپ ہے۔ آزاد کشمیر کے شاعر مخلص وجدانی کی نظم پیرچناسی اس حوالے سے قابل ذکر ہے۔ جس میں اس علاقے کی خوب صورتی کو نہایت عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مخلص وجدانی کی نظم پیرچناس ملاحظہ ہو:

مطلع دیوانِ فطرت قلعہ رفعت شناس

اے مرے کوہ محبت اے میرے کوہ چناس

اے چناس

دست قدرت نے کیا تحریر مضمون لطیف

تو اُسی مضمون کا ہے خوب صورت اقتباس

اے چناس

مہر و مہ سے رفعتوں کی داد کرتا ہے وصول

تیرے شائق پیش کرتے ہیں تجھے حرف سپاس

اے چناس

خوانِ مہمانی بچھا رکھتا ہے تو سب کے لیے

پیار سے تو کاروانوں کو بٹھالیتا ہے پاس

اے چناس

فرش سبزے کا بچھا رکھا ہے مخمل کی طرح

کس قدر رہتا ہے تجھ کو اپنے مہمانوں کا پاس

اے چناس

پائے استقلال میں آتی نہیں لغزش ترے

کم نظر انسان تجھ کو خود پہ کرتا ہے قیاس

اے چناس

موسموں کے بھی تغیر پر نظر رکھتا ہے تو

ان کے تیور دیکھ کر تو بھی بدلتا ہے لباس

اے چناس

سردیوں میں اوڑھ لیتا ہے تو چادر برف کی

گرمیوں میں تو پہن لیتا ہے سبزے کا لباس

اے چناس

منہ چھپا کر ابر کی چادر میں روتا ہے جو تو

کیا تجھے میری طرح حالات رکھتے ہیں اُداس

اے چناس[۱۲]

یہ نظم مقاماتی ادب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں آزاد کشمیر کے خوب صورت پہاڑی علاقے پیر چناسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نظم میں مخلص وجدانی نے اس علاقے کو فطرت کا حسین مطلع اور اس پہاڑی کو فطرت کا عروج قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ پہاڑی محبت کی پہاڑی ہے۔

یہ کیسی پہاڑی ہے جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ جہاں سے سورج اور چاند ستارے بھی اس کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔اس پر جو بھی جاتا ہے وہ اس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ تا حد نگاہ تک پھیلے ہوئے سبزے کے فرش لوگوں کے بیٹھنے کے کام آتے ہیں۔ یہ ایسی پہاڑی ہے جس پر موسم بھی اپنے رنگ بدلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سردیوں میں یہ پہاڑی اپنے اوپر برف کی چادر تان لیتی ہے تو گرمیوں میں اس پہاڑی پر سبز رنگ کا لباس آ جاتا ہے۔

یہاں کی ایک اور خاص بات یہ بھی ہے کہ ہر شام اس پہاڑی پر تقریبا بارش کا موسم بنا رہتا ہے۔ شاعر آخر پر یہ کہتا ہے کہ یہ جو تجھ پر ہمیشہ بارش برستی ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو بھی میری طرح ایک غم کو چھپا کر رہتی ہے۔ لیکن تو اپنی اداسی کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ مکمل نظم میں شاعر نے فطرت کی تعریف کی اور انسان کی فطرت کے ساتھ موجود محبت کو ظاہر کیا ہے۔ یہ نظم مقاماتی ادب میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے جو کہ اس نظم میں ایک مقام کے ماحولیاتی تناظر کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جہاں اس نظم میں قدرت اور فطرت کی تعریف کی گئی ہے وہیں پر اس کا انسانوں کے ساتھ تعلق بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ فطرت ہمیشہ سے مہمان نواز رہی ہے اور یہ کسی کو بھی اپنے ہاں سے ناراض کر کے نہیں بھیجتی بل کہ جو بھی فطرت کا مہمان بن کے جاتا ہے فطرت اس کی خوب مہمان نوازی کرتی ہے۔ گویا یہ نظم ماحولیاتی ادب میں مقاماتی ادب کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے۔

مظفر آباد جب تک شہر نہیں تھا تو اسے چکڑی بہک کا نام دیا جاتا تھا بہک ہندکو زبان کا لفظ ہے جس کے لیے اردو میں ڈھوک کا لفظ مستعمل ہے۔ ڈھوک یا بہک ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں پر انسانی آبادی نہ ہو۔ یہ علاقہ صرف موسمی طور پر آباد کیا جاتا ہے جسے گرمیوں کے موسم میں کشمیر کے وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو مال مویشی پالتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے علاقوں میں چلے جاتے ہیں جہاں پر گھاس وغیرہ کی دستیابی آسان ہو۔ تا کہ کھیتوں میں موجود فصل بچی رہے۔ مظفرآباد کے حوالے سے تحریر کردہ ڈاکٹر صابر آفاقی کی نظم چکڑی بہک ملاحظہ کیجیے:

چکڑی بہک

اس شہر دل افروز کی بھاتی ہیں ادائیں

پر کیف زمیں ہے تو جنوں خیز فضائیں

سلتی ہیں یہاں پھول کی صد رنگ قبائیں

ملتی ہیں گلے نیلم و جہلم کی گھٹائیں

یہ شہر پہاڑوں میں نگینے کی طرح ہے

یہ کوہ کی موجوں میں سفینے کی طرح ہے

یہ طور مرا، پیر مرا، پیر چناسی!!!

ہونے نہیں دیتا یہ ہوا شہر کی باسی

رہتا ہے مہ و برف کی اوڑھے یہ رداسی

پانی یہ پلاتا ہے جو مخلوق ہو پیاسی

اس کوہ کے دامن میں مرا شہر بسا ہے

میں جتنا مقدر پہ کروں ناز بجا ہے

یہ دائرہ کوہ مرے چاند کا ہالہ

اس چاند کا دل باغ عدن، چاند جلالہ

یہ باغ جو ہے باعث داغ گل لالہ

ہے طشت منقش میں زمرد کا پیالہ

چلتی ہیں یہاں مہر و محبت کی ہوائیں

قربانی و ایثار کی، اُلفت کی ہوائیں

اس سمت ہیں جہلم کی طرحدار بہاریں

اس سمت ہیں نیلم کی ضیابار بہاریں

مشرق میں دکھاتا ہے جو کہسار بہاریں

رکھتا ہے عجب گوجرہ اُس پار بہاریں

یہ شاہ عنایت ہے وہ سرکار سہیلی

خوشبو انھی پھولوں سے مرے شہر نے لے لی

کشمیر کی صنعت کا نگہباں بھی ہے یہ شہر

شعر وادب وفن سے فروزاں بھی ہے یہ شہر

تہذیب وثقافت کا گلستاں بھی ہے یہ شہر

اللہ کے انعام کا عنواں بھی ہے یہ شہر

سرمایہ دل، رونق ایمان بھی یہ ہے

آزادی ملت کا نگہبان بھی یہ ہے

اس شہر میں نفرت نہ تعصب نہ جفا ہے

اس شہر کا انداز ہی شہروں سے جدا ہے

ہر شخص یہاں پیکر اخلاص ومتاع ہے

سینے میں اگر نور ہے چہرے پہ ضیا ہے

تعمیر پہاڑی پہ ہوا خاک سے اونچا

یہ شہر طربناک ہے افلاک سے اونچا

نیلم کا جو دریا ہے مئے ناب یہی ہے

ڈھونڈا تھا جسے خضر نے وہ آب یہی ہے

مٹی پہ تڑپتا ہوا سیماب یہی ہے

دریا جو زمانے میں ہے کمیاب یہی ہے

دجلہ میں نہ یہ جوش نہ جیحوں میں روانی

دریا ہے یہ وہ جس کا نہیں ایک بھی ثانی

رنگ مئے گلفام خجالت سے ہے میلا

کہتا نہیں ساقی سے کوئی رند کہ مئے لا

اُس اور ہے دو میل تو اِس اور چھیلا

اس بیچ میں دریا کے مئے ناب ہے پھیلا

دریائے مئے ناب ہی اس شہر کی جاں ہے

جو بات ہے اس شہر میں وہ بات کہاں ہے

مسکن ہے مرا آج جو نیلم کے کنارے

نزدیک سے کرتا ہوں مناظر کے نظارے

لہروں کی روانی ہی مری فکر سنوارے

موجوں کی روانی چمن شعر نکھارے

اک موج اٹھی اور بہالے گئی مجھ کو!

اک خواب کی وادی میں اٹھالے گی مجھ کو [۱۳]

گھاس وغیرہ کی کمی کی وجہ سے لوگ گرمیوں میں اس کو بچا کر رکھتے ہیں تاکہ سردیوں میں مویشیوں کو غذائی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑے چونکہ سخت سردی اور برف باری کے باعث آزاد کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں گھاس اور دیگر چیزوں تک رسائی تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے اس لیے گرمیوں کے موسم میں لوگ بہکوں کی طرف چلے جاتے ہیں وقت گزار کر زمینوں کی گھاس کو سردی کے موسم میں استعمال کیا جا سکے۔ مظفر آباد شہر بننے سے پہلے ایک بہک کے طور پر ہی جانا جاتا تھا۔ اس نظم میں مظفر آباد جیسے خوب صورت اور پر فضا مقام کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ جس میں شاعر نے نہایت سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ وہاں کی فطری زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔

شاعر نے گویا مقاماتی ادب میں فطرت کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ جس میں سورج طلوع ہونے کے منظر کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد وہاں کی خودرو جھاڑیوں، سورج کی کرنوں، ٹھنڈی ہواؤں، اور لہراتی شاخوں کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب ایسے کھل کر اٹھلا رہے ہیں جیسے کوئی شوخ چنچل اور حسین لڑکی بانہوں کو لہرا رہی ہو۔ تتلیوں کی صبح کے وقت خوش کن آمد اور دریاؤں کی روانی اس تمام منظر میں گویا چار چاند لگا دیتی ہے۔ مظفر آباد جو پہاڑوں کے دامن میں گھرا ہوا ایک خوب صورت شہر ہے۔ گرد و پیش سے آنے والی ہوائیں اس کے درجہ حرارت کو کم کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ نظم میں مقاماتی ادب کے تمام تقاضوں کو نبھایا گیا ہے۔ جس میں صابر آفاقی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کشمیر کی تعمیر و بنیاد کی بات کر رہے ہیں آخر پر اس نظم میں کشمیری تہذیب و ثقافت کے علمبردار غنی کاشمیری اور حبہ خاتون کی گئی ہے

ایک شاعر جب کسی حسین چیز کو دیکھتا ہے تو اس کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ بار بار اس چیز کو دیکھے اور اس کی تعریف میں چند کلمات ادا کرے۔ اس کی خوب صورتی کو نظم میں بیان کرے۔ لیکن جب اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ چیز کسی کی قید میں ہے تو اسے اس بات کا بہت زیادہ دکھ ہوتا ہے۔ دکھ اور خوشی کا یہ ملا جلا رجحان رومان اور غصے کو جنم دیتا ہے جو ماحولیاتی شاعری کا باعث بنتا ہے۔ جس میں ایک شاعر کسی جگہ کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اس پر ہونے والے ظلم کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اس حوالے سے منور قریشی کی ایک نظم" نظارہ "ملاحظہ کیجیے:

نظارہ

صحن گلشن میں صبا کی ساری باتیں بند ہیں

چہچہے قمری کے اور کوئل کی تانیں بند ہیں

غنچے لب بستہ ہیں اور کلیوں کی آنکھیں بند ہیں

صبح کے زندانوں میں جانے کتنی صحبتیں بند ہیں

وادی کشمیر ہے یوں ساری کی ساری خموش

بادشہ کے سامنے جیسے ہوں درباری خموش

اونچی، نیچی گھاٹیوں کو پھاندتی جہلم کی موج!

سنگریزوں سے اُلجھتی، کھیلتی جہلم کی موج

کف اُڑاتی، سر پٹختی، پیچیختی جہلم کی موج

اپنے پیاسے ساحلوں کو دیکھتی جہلم کی موج

وادیوں میں بہہ نکلنے کے لیے بے تاب ہے

تنگیِ داماں میں ہے اور صورت سیماب ہے

وادیِ لولاب کے منظر، کہیں پر پہل گام

اہر بل کی آبشاریں، چشمۂ شاہی سے مقام

اس طرف سے اُس طرف لہریں کہیں محو خرام

ڈل کے ماتھے کی ہر سلوٹ یہ دیتی ہے پیام

اس حسین بستی پر کوئی سوچ نہ طاری رہے

کہر میں ڈوبی فضا سے معرکہ جاری رہے [۱۴]

اس نظم میں ایک شاعر نے اپنے جذبات اور احساسات کو نہایت خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ جس میں ایک شخص کی فطرت کے لیے محبت اور کسی علاقے پر ہونے والے جبر کے خلاف غم و غصے کا اظہار نظر آتا ہے۔ یہ نظم منور قریشی کی ان نظموں میں سے ہے جن میں بھارت کے خلاف اور کشمیر کے حق میں آواز اٹھائی گئی ہے۔ اس نظم میں فطرت اور فطرت پر ہونے والے جبر کو خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہاں کے ماحول اور ماحولیاتی عناصر کو بھی نہایت عمدہ انداز میں پیش کر دیا گیا ہے۔ جس میں شاعر کی شعری عظمت کے ساتھ ساتھ اس کی زیرک نظری اور مشاہدہ بھی نظر آتا ہے۔ اس نظم میں شاعر ہمیں ایک ایسے انسان کی صورت میں نظر نہیں آتے کہ جو صرف مشاہدہ اور نظارہ کر رہا ہے بل کہ اس شخص کی صورت میں نظر آتے جو اس کو چھڑانے کے لیے صدائے احتجاج بھی بلند کر رہا ہے۔

کشمیر جس کو جنت نظیر بھی کہا جاتا ہے ہمیشہ سے سیاحوں کی جنت رہا ہے۔ سیاحوں کی پہلی پسند ہمیشہ سے کشمیر ہی رہا ہے۔ کشمیر کی خوب صورتی میں کھو کر کئی شعرا نے اس پر شاعری کی۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جو ہمیشہ سے شعر ا اور نثر نگاروں کی نظر میں رہا ہے اور انھوں نے اپنے ادب میں اس علاقے کو بھرپور جگہ عطا کی ہے۔ یہ علاقہ جغرافیائی اعتبار سے بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس علاقے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ علاقہ ہر ایک شخص کو اپنی طرف مائل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ شعر ابھی اس علاقے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اپنی شاعری میں اس کو جگہ دیتے ہیں۔ آزاد کشمیر کی خوب صورتی کے حوالے سے ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

ہر جگہ کو بہ کو فرش پہ چار سو

جنتی رنگ و بو میرے کشمیر تو

لالہ زارِ چمن، وادیاں گل بدن

بستیاں ماہ رو میرے کشمیر تو

دلنشیں گھاٹیوں کی معطر پون

مرمریں چوٹیاں، سرسراہٹ سخن

آبشاریں ترنم، ندی موجزن

سندلیں خال وخو میرے کشمیر تو

برف زاراں ضحیٰ، مرغزاراں شفاء

عصمت و پیرہن سبزہ زاراں رداء

جنگلاں، مالیاں، شاعرانہ عطاء

سب تیری گفت گو، میرے کشمیر تو[۱۵]

مقاماتی ادب کے لیے لازمی ہے کہ ایک مصنف یا شاعر کسی مقام کو اس طرح سے بیان کرے کہ اس نے اس علاقے کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی ماحولیاتی پیش کش نظر آئے۔ درج بالا نظم میں شاعر نے فطرت کی پیش کش نہایت عمدہ انداز میں کی ہے۔ شاعر ایک مقام کے ساتھ ساتھ اس کا ماحول اور اس میں موجود فطرت کو بھی نظم میں شامل کر رہے ہیں جو مقاماتی ادب کا بنیادی نقطہ ہے۔

اس نظم میں شاعر اسرار احمد نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ اپنے علاقے کے ماحول اور خوب صورتی کو بیان کیا ہے۔ جس میں اسرار احمد کہتے ہیں کہ میرا علاقہ سب سے زیادہ خوب صورت، سب سے زیادہ فطری ماحول رکھتا ہے۔ وہ اپنے علاقے کی خوب صورتی کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید بتاتے ہیں کہ میرے علاقے میں میدان ہیں سبز اس طرح سے پہاڑوں پر پھیلا ہوا ہے جیسے کوئی جنت کا نظارہ کر رہا ہو۔

شاعر اسرار احمد کہتے ہیں کہ ہر طرف دل کش و دل نشیں گھاٹیاں ہی نظر آتی ہیں اور ان سے اٹھنے والی خوب معطر خوش بو ہر شخص کے دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے. نرم و گداز چوٹیاں جو اتنی پر سکون ہیں کہ اگر ان پر سرسراہٹ بھی ہو تو شاعری معلوم ہوتی۔ نہایت خوب صورت ندیاں بہتی ہیں اور آب شاروں کا ترنم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شخص اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔

III غزل میں مقاماتی ادب:

فطرت نے اپنے گرد و پیش میں کئی چیزوں کو تخلیق کر رکھا ہے جو انسان سمیت ہر ایک جان دار کے لیے خوشی اور مسرت کا ذریعہ ہیں۔ انسان اسی خوشی کی تلاش میں دنیا بھر کے چکر لگاتا ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ پر سفر کرتا ہے۔ مصیبتیں اٹھاتا ہے، رنج و الم مول لیتا ہے کہ اسے خوشی کی چند گھڑیاں اور مسرت کے کچھ لمحات میسر آئیں۔ مگر انسان کی اپنی ہی وجہ سے یہ ساری مسرت اور خوشی اس سے روٹھ چکی ہے۔ جب سے انسان نے ہر چیز کو کار و باری نظر سے دیکھنا شروع کیا ہے تو اس کے اندر ہوس اور لالچ نے اپنا گھر کر لیا ہے۔ اب انسان ہوس سے بھرپور اور لالچی ہو چکا ہے۔ اس نے لالچ میں آ کر اپنے گرد و پیش میں موجود فطرت کو بھی بیچنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے انسان کا اس زمین پر سانس لینا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ زمینوں کی خرید و فروخت اور اس کی شکست و ریخت اب انسان کا وتیرہ بن چکی ہے۔ انسان اپنے علاوہ باقی سب انسانوں سمیت باقی جانداروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا فائدہ اور نقصان دیکھتا ہے۔ فطرت کی شکست و ریخت اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں رہی شفیق راجا اپنے ایک قطعے میں لکھتے ہیں:

سو یوں کرتے ہیں چلتے ہیں مگر چلنے سے کچھ پہلے

یہ جھیلیں وادیاں دریا سمندر بیچ دیتے ہیں

ابھی تو لوگ محوِ خواب ہیں سو ایسا کرتے ہیں

دیوسائی سیاچن اور گوادر بیچ دیتے ہیں[۱۶]

اگرچہ یہ اشعار غزلیہ ہیں تاہم ان دونوں اشعار میں ایک ہی بات کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں بھی وہی بات بیان کی گئی ہے کہ انسان کس طرح سے اپنی زمین کی شکست اور ریخت میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس بات سے اسے کوئی غرض نہیں ہے کہ اس کی جھیلیں، وادیاں، دریا اور سمندر بیچے جا رہے ہیں۔ یہ بس یہ دیکھتا ہے کہ اس کو دیکھنے والا کوئی اور انسان نہ ہو۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے پاس زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی ہو جائے۔ چاہے اس کے لیے اسے باقی انسانوں کی جان ہی نہ کیوں لینی پڑے۔ دوسرے شعر میں شاعر شفیق راجا نے مختلف مقامات کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ لوگ تو محوِ خواب ہیں آیئے ہم ان علاقوں کو بیچ دیتے ہیں کیوں کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ یہ علاقے کس نے بیچے ہیں۔ یہ سارا منظر نامہ ہمارے حکمرانوں پر بالکل صادق آتا ہے

کیوں کہ وہ یہ سب کرنے سے بالکل بھی گریز نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے شفیق راجا کے درج بالا شعر کو مقاماتی ادب میں جگہ دی گئی ہے کیوں کہ ان اشعار میں مقامات کے ناموں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رویوں اور فطرت کا ذکر بھی موجود ہے۔

زلزلہ بھی فطرت کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ جس کی وجہ سے پوری کی پوری زمین بری طرح سے لرز اٹھتی ہے اور ایک ہی وقت میں انسانوں کے بنائے ہوئے مکانات الٹ جاتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دنیا بھر کے باقی جاندار اپنے لیے کوئی اس طرح کے پکے مکانات ہی نہیں بناتے کہ جن کے الٹ جانے سے انھیں کوئی نقصان ہو گا۔ جیسے ایک چڑیا اپنے گھونسلہ بناتی ہے جس کے ٹوٹ جانے پر ایک نیا گھونسلہ تیار کرنا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہیں جب کہ اس کے برعکس انسانی معاشرے میں جو مکانات تیار کروائے جاتے ہیں وہ انسان ایک زندگی میں ایک ہی مرتبہ بنا سکتا ہے دوبارہ مکان تیار کرنا ایک انسان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ آزاد کشمیر سمیت شمال مشرقی پاکستان میں ۲۰۰۵ کے زلزلے نے اپنی خوب تباہ کاریاں دکھائیں جس کو شاعر نے اپنے اشعار رقم کیا ہے اشعار ملاحظہ کیجیے.

اک لرزے سے ساری دھرتی چور ہوئی

دھرتی کو ارمان میں رکھیو اللہ میاں

یہ کشمیر جو پاکستان کی شہ رگ ہے

اس کو پاکستان میں رکھیو اللہ میاں[۱۷]

ان اشعار میں جہاں فطرت کی بات ہے وہیں پر مقامات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ان اشعار میں بھی شاعر نے یہ دعا کی ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے تو اے خدا تو کشمیر کو پاکستان کے ساتھ رکھنا۔ درج بالا اشعار میں مقاماتی ادب کے لحاظ سے بہتر انداز سے پیش کیا گیا ہے کیوں کہ ان اشعار میں مقامات کے نام اور فطرت کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ لایا گیا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ زلزلے اور باقی ساری آزمائشیں

بھی قدرت کی طرف سے ہوتی اس لیے اللہ تعالی سے دعا کی گئی ہے کہ کہ وہ اس دھرتی کو سکون اور امن دے تا کہ یہاں کے لوگ امن اور سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔

انسان فطرت کا ایک با کمال شاہ کار ہے جس میں فطری رنگوں کو نہایت خوب صورتی سے برتا گیا ہے۔ انسانی جسم کائنات کی ہر ایک چیز کا مظہرِ اتم ہے۔ جس نے کائنات کی ہر چیز کا کوئی نہ کوئی رنگ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو باقی تمام مخلوقات سے افضل ترین سمجھتا ہے۔ آزاد کشمیر کی مقاماتی شاعری میں اس طرح کی بازگشت سننے کو ملتی ہے جس میں کسی انسان کو کسی ماحولیاتی چیز کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ شفیق راجا کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

چہرے پہ کئی گہرے برف زاروں کی یورش

دیدوں میں لہو رنگ قیامت کی علامت

ہے سوچ کے طیور کی پرواز فلک تک

جذبوں میں ارادوں میں ہمالہ کی سی رفعت[۱۸]

اشعار میں ایک انسان کے چہرے کی بات کی گئی ہے کہ جس پر برف زاروں کی یورش کی بات کی گئی ہے۔ برف زاروں کی یورش سے یہاں پر مراد ایک انسان کے چہرے پر پھیلا ہوا سفید رنگ ہے یعنی اس کے بڑھاپے کی علامت ہے دیدوں میں لہو رنگ سے مراد اس کی آنکھوں میں اترا ہوا خون ہے۔ یہ بھی بڑھاپے کی علامات میں سے ایک ہے۔ دراصل شاعر نے اس شعر میں انسان کے جذبات کی بات کی ہے کہ وہ کبھی ماند نہیں پڑتے۔ جذبات ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔ اشعار میں ہمالہ کی بات کی گئی جو ایک پہاڑی سلسلے کا نام ہے جس میں دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سے کچھ پہاڑ آتے ہیں۔ دراصل شاعر نے یہاں پر انسان کے ساتھ ساتھ فطرت کو بھی اشعار میں شامل کر رکھا ہے جس کی وجہ سے ان اشعار کو ماحولیاتی تنقید کے نظریے مقاماتی ادب میں شامل کیا گیا ہے۔ جن میں انسان اور فطرت کو ایک ساتھ برتا گیا ہے۔

مکڑا کی طرح بیٹھ نہ رہنا اسے کہنا

ہمسایہ نیلم ہے تو بہنا اسے کہنا[۲۰]

صابر آفاقی نے اس اردو شعر میں دو مقامات مکڑا اور نیلم کا ذکر کیا ہے۔ چٹانوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی جگہ پر قائم و دائم رہتی ہیں وہ کسی بھی طرح ہجرت نہیں کرتیں۔ ہر وقت ایک ہی جگہ پر ٹھہری رہتی ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے تمثیلی انداز اپناتے ہوئے مکڑا پہاڑی کو شعر میں شامل کیا ہے۔ جس میں وہ پہاڑ کی خاصیت کو سامنے رکھتے ہوئے انسان کو اس موضوع کی خصوصیت سے باز رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ مکڑا مظفر آباد کے شمال مشرق میں واقع ایک پہاڑ کا نام ہے جس پر بہت سے پر فضا مقامات اور جھیلیں موجود ہیں۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں سیاح سیر کی غرض سے جاتے ہیں۔

دوسرا نام نیلم کا ہے یہ بھی آزاد کشمیر کا ایک سیاحتی مقام ہے۔ تاہم کشن گنگا دریا کو دریائے نیلم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس دریا کا پانی برفانی تودوں اور انتہائی ٹھنڈے علاقوں سے ہو کر آتا ہے اس لیے اس کا پانی نہایت ٹھنڈا اور شفاف ہوتا ہے۔ شاعر نے انسان کو دریا کی اس خوبی سے متاثر ہونے کا درس دیا۔ آزاد کشمیر کے جغرافیے میں ان دونوں مقامات کو ماحولیاتی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔۔ شاعر نے شعر میں خوب صورتی کے ساتھ ان دونوں مقامات کی فطرت اور خاصیت کو بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس شعر کو مقاماتی ادب کی ذیل میں رکھا گیا ہے۔

پیار کا موسم خشک بہت تھا اور مجھ کو احساس بہت

پیاسی نظریں دیکھ رہی تھیں یارو پیر چناس بہت[۲۱]

ماحولیاتی تنقید زیادہ تر متعلق ہوتی ہے جس میں کسی بھی جگہ کی ماحولیاتی پیش کش کو پیش کیا جاتا ہے۔ مقاماتی ادب ماحولیاتی تنقید کی ایک شاخ ہے جو مقام کے ساتھ ساتھ وہاں کی ماحولیات کے بارے میں بھی بات کرتی ہے۔ درج بالا شعر میں مخلص وجدانی انتہائی خوب صورت انداز میں یہ کہ رہے ہیں کہ موسم بہت زیادہ خشک تھا جس کا مجھے بہت زیادہ احساس ہو رہا تھا۔ میں پیاسی نظروں سے پیر چناسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یہ بات مظفر آباد اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے لوگ ہی جان سکتے ہیں کیوں کہ پیر چناسی ایک ایسا پر فضا مقام ہے جہاں سے ہر وقت ٹھنڈی ہواؤں کے ریلے بہتے نظر آتے ہیں۔ گرمیوں میں بھی سردیوں کا سماں ہوتا ہے۔ اونچی چوٹیاں ہر وقت دھند سے ڈھکی رہتی ہیں۔ درج بالا شعر مقاماتی ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا

ہے کیوں کہ اس میں ایک ایسے ماحولیاتی عنصر کی بات کی گئی ہے جو آزاد کشمیر میں اور بالخصوص مظفر آباد میں اپنا ایک الگ اور منفرد مقام رکھتا ہے۔

IV راعیانیت:

راعیانیت کا لفظ عربی زبان کے لفظ راعی سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی چرواہے کے ہیں۔ انگریزی زبان میں pastoral کو راعی کا مترادف کہا جا سکتا ہے۔ راعیانیت ماحولیاتی تنقید کا ایک اہم ترین نظریہ ہے۔ جس کے مطابق قدیم زندگی کو جدید زندگی سے بہتر قرار دیا جاتا ہے۔ گاؤں کی زندگی کو شہری زندگی پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان کی وہ زندگی بہتر ہے جو فطرت سے قریب تر ہے۔ ہر وہ زندگی بد تر ہے جس سے انسانی زندگی فطرت سے دور ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے یہ تنقیدی نظریہ شہری زندگی پر دیہی زندگی کو فوقیت دیتا ہے کیوں کہ دیہی زندگی شہری زندگی کی نسبت زیادہ فطری ماحول سے متاثر ہو رہی ہوتی ہے۔

> "The pastoralists try to identify for their particular environment the optimal combination of location and timing to maximize benefit for the animals—high quality and quantity of pasture, good water, and favorable emperatures—and minimize detrimental influences—extreme temperatures, lack ofbwater or pasture, exposure to disease, and vulnerability to human or animal predators" These considerations lead to decisions concerning how and when to move herds. [۲۳]

راعیانیت میں راعیانہ ادب بھی شامل ہوتا ہے۔ راعیانیت لفظ راعی سے نکلا ہے جس کے معنی بھیڑ اور بکری چرانے کے ہیں۔ راعیانہ ادب میں ایک ایسے شخص کی بابت بات کی جاتی ہے جو بھیڑ بکریاں چراتا ہو۔ خانہ بدوش کی سی زندگی گزار رہا ہو۔ اس کی زندگی بھی فطرت کے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے کیوں کہ یہ زندگی فطری زندگی کے بہت زیادہ قریب ہوتی ہے۔ یہ زندگی تصنع یا

بناوٹ سے بالکل پاک، خالص اور سادہ ہوتی ہے۔ جس میں ایک انسان اپنی ضروریات کے مطابق اپنا مسکن بدلتا ہے۔ وہ فطرت کو دیکھتا اور جانتا ہے اس کو ہر طرح سے فطرت نوازتی ہے۔ اسے دنیا کے ساتھ مقابلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بقیہ جان داروں کی طرح موسمی ہجرت پر مجبور ہوتا ہے۔ ایسی زندگی کی پیش کش راعیانیت ہے۔

> The study of pastoralism is an ideal way to explore ecological relationships because it involves symbiotic connections between humans and domesticated animals, with a series of cascading effects in political, social, economic, and religious organization. Conversely, an ecological framework offers perhaps the best way to explain the inherent flexibility of herding/animal husbandry system.[۲۴]

راعیانیت ایک ایسا طرز عمل ہے جو زندگی کو فطرت سے قریب ترین کر کے رکھتا ہے۔ اس مکتب میں ایسے ادب کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے جس نے ایک انسان آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہا ہو اور اسے کسی بھی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑ رہا ہو۔ اسے ہر طرح کی پابندی سے آزاد رکھا گیا ہو۔ ایک ایسے انسان کی زندگی جو ویزے سے آزاد ہو۔ جو مروجہ نام نہاد انسانی تہذیب کے خلاف بر سر پیکار ہو ایسے شخص کی ادب میں پیش کش راعیانیت کے زمرے میں آتی ہے کیوں کہ یہ فطرت سے قریب تر ہے۔

آبادی اور زندگی سے اکتا کر دیہی زندگی کو اپنانا اور اس کی ادبی پیش کش میں دیہی زندگی کو شہری زندگی پر ترجیح دینا راعیانیت کہلاتا ہے۔ راعیانیت میں ایک ادیب دیہی زندگی کو سادہ مگر فطرت کے زیادہ قریب ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لارنس بیول لکھتے ہیں:

> Traditional pastoral, dating from the poetry of Theocritus, is a stylized representation of rusticity in contrast to and often in

satire of urbanism, focusing in the first instance on the life of shepherds. In the early modern and romantic eras, as in seventeenth century English country house poems and in Wordsworthian lyric, pastoral becomes more mimetically particularized, and more given over to representation of country ways that are being displaced by enclosure and/or urbanization.[۲۵]

ادب کی اس پیش کش کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ادیب ایسے کردار تخلیق کرتا ہے جو اپنے ماحول کو نقصان پہنچائے بغیر فطری عناصر کے ساتھ مل کر زندگی گزارتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق کوئی بھی ماحولیاتی عنصر کسی دوسرے ماحولیاتی عنصر کے استحصال کے بارے میں نہیں سوچتا بل کہ اس کے ساتھ رہ کر زندگی گزارتا ہے۔

V نظم میں راعیانیت :

زمین پر نمودار ہونے کے کچھ عرصے بعد انسان نے تعمیری اور تخریبی کام شروع کر دیے جو قدرتی ماحول کی شکست و ریخت کا موجب بنے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی عوامل میں بھی تیزی آتی گئی۔ جس کے باعث زمین پر انسان بلا شرکت غیرے اپنی آسانی کے لیے تبدیلیاں کرنے لگا۔ انسان کے اس رویے نے باقی تمام جانداروں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ یہ عوامل جہاں انسان کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور پر سود مند تھے وہیں پر ان تمام عوامل نے زندگی کو کافی متاثر کیا۔ انسانی آبادیوں سمیت ہر طرح کے جان دار کی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوئے انسان جب تک پتھر کے زمانے میں تھا تو اسے نمود و نمائش اور تزئین و آرائش کی ضرورت نہیں تھی یہ محض کھانے کے لیے زندہ تھا۔ انسان اس لیے بھی خوش قسمت تھا کہ اگر اسے سبزی میسر آئے تو اسے کھا لیتا تھا اور اگر گوشت میسر آجائے تو اس سے بھی اپنا پیٹ بھر لیتا تھا لیکن انسان جب اپنی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھایا تو فطری ماحول میں طرح طرح کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہونے لگیں۔

آج کا انسان قدیم انسانوں کی نسبت بہت زیادہ ترقی یافتہ اور سہولیات سے لیس ہے۔ تاہم اس کی یہ ترقی اس کو کافی مہنگی پڑی ہے۔ اسی لیے انسانوں میں قدیم انسانوں والی محبت اور انسیت تقریبا ً مفقود چکی ہے۔ انسان کو طرح طرح کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آئے روز کی نت نئ ایجادات اس کی مجبوری بنتی جارہی ہیں۔ جس سے اس کی زندگی دوبھر ہوگئی ہے۔ یہ بات کافی حد تک درست بھی ہے کہ آج کا انسان اخلاقی سماجی اور ثقافتی سطح پر تنزلی کا شکار ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ آرام کے لیے چند ہی لمحے سہی لیکن فرصت نکال سکے۔ راعیانیت جدیدیت کے ہاتھوں انسان کی بے بسی کے خلاف بلند ہونے والے علم کا نام ہے۔ شعرا اپنی طبیعت کے مطابق آزاد خیال واقع ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں مذہبی، سیاسی، ثقافتی یا سماجی سطح کی کوئی سرحد موجود نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ہر غیر فطری امر کی کھل کر مخالفت ملتی ہے۔

آزاد کشمیر کی اردو نظم میں راعیانیت کے نظریے کو عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ آزاد کشمیر کے اردو شعرا کے ناس ٹیل جیا میں قدیم تہذیب کی چمک دھمک اور دیہی زندگی کے ساتھ ساتھ راعیانہ طرز فکر بھی موجود ہے۔ جو کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک تقریبا پورے آزاد کشمیر کی تہذیب کا ایک اہم ترین حصہ تھا۔ اس بات سے کوئی انکار ممکن نہیں کہ آزاد کشمیر میں راعیانہ ادب کی ترویج و ترقی پہلے کی نسبت زیادہ ہو رہی ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم میں راعیانہ طرز فکر کی مقدار اگرچہ کم ہے تا ہم اس کے معیار پر کوئی بھی سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ آزاد کشمیر کے اردو شعرا نے نظم میں راعیانہ ادب کو نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی سے برتا ہے۔ جس میں ایک راعی کی زندگی کو خوب صورت اور نرالے انداز میں سادگی کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے آزاد کشمیر کے اردو شعرا کی شاعری کی باز گشت اردو ادب کے اہم ترین مراکز تک سنی جا سکتی ہے۔ جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آزاد کشمیر کی اردو شاعری کسی بھی دوسرے علاقے کی نسبت کم نہیں ہے۔

ایک راعی کی زندگی بہت زیادہ مختلف اور فطرت سے بہت زیادہ قریب ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کے بے شمار گوشے ایک عام انسان کی نظر سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ایک راعیانہ ادیب ہی ان پر نظر دوڑا کر اپنے قاری کی توجہ اس طرف مبذول کروا سکتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ زندگی بہت زیادہ کٹھن ہوتی ہے تا ہم ایک انسان جو اس تمام منظر نامے کو بہت غور سے دیکھتا ہے وہی انسان اس

سے آشنا ہو سکتا ہے کہ اس زندگی میں جہاں سہولیات کی کمی ہوتی ہے وہیں پر اس زندگی کی سہل پسندی اس قدر خوب صورت ہے کہ انسان اس میں جینا شروع کر دے۔ سہل پسندی ان معنوں میں کہ انسان کو موجود و میسر کی زیادہ فکر کرنا نہیں پڑتی۔ ایک انسان کے لیے ایک وقت میں جتنی چیزیں ضروری ہوں بس انھی کو صرف کرتا ہے۔ اس زندگی کی واحد ضرورت خوراک ہے۔ باقی تمام تر چیزیں غیر ضروری تصور کی جاتی ہیں۔ مگر انسانی آبادیوں میں غذا کے علاوہ ہر ایک چیز کو بہت نہایت اہم سمجھا جاتا ہے۔ سید قاسم سیلانی نے راعیانہ زندگی پر ایک نہایت نفیس نظم تحریر کی ہے نظم ملاحظہ کریں:

آزادی

اک میلی کچیلی سی چادر

اور پھٹے پرانے کپڑوں میں

اک خوبرو سی شرمیلی سی

اک میلی کچیلی لڑکی ہے

بن جوتوں کے

روزانہ گھر سے

وہ ننگے پاؤں چلتی ہے

پتھروں سے ٹکر اٹکرا کر

پیروں کے ناخن ٹوٹ گئے

کانٹوں سے چھلنی پاؤں ہیں

زخموں سے رستا خون بھی ہے

دو پہر کا سورج بھی سر پر

اوپر سے مہینہ جون بھی ہے

اس کی نگرانی میں گھر کی

۱۳۹ سفر سرائے اور سیلانی

کچھ بکریاں، بھیریں، ممیانے

اُس کی اپنی اک دنیا ہے

وہ اور کسی کو کیا جانے

ہر غم سے بے پروا ہو کر

وہ ہنستی دوڑتی گاتی ہے

نہ گرمی میں گھبراتی ہے

نہ بھوک اُسے تڑپاتی ہے

اُس کا اک باڈی گارڈ بھی ہے

وہ اُس کو موتی کہتی ہے

وہ اُس کا پالتو کتا ہے

جو ساتھ ہی دن بھر رہتا ہے

وہ اس ریوڑ کی ملکہ ہے

وہ ان پہ حکومت کرتی ہے

وہ خوش ہے کہ

آزاد ہے وہ[۲۶]

اس نظم میں رعیانہ زندگی کی ہر خوبی اور خوب صورتی کو بیان کرتے ہوئے سید قاسم سیلانی نے راعی لڑکی کو مرکزی کردار کے روپ میں دکھایا ہے۔ جس کا کام بھیڑ بکریوں کو چرانا ہے۔ جو سارا دن بھیڑ بکریوں کے ساتھ گزارتی ہے ۔ اس راعی لڑکی کی زندگی میں جو خوشیاں اور پریشانیاں ہیں ان سب کو سید قاسم سیلانی نے اپنے مزاج کے مطابق اور سہل انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ایک لڑکی کی تصویر کشی کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس کا لباس ہے پھٹا پرانا ہے ۔ اس نے سر ڈھانپنے کے لیے جس چادر کا سہارا لیا ہے وہ بھی میلی کچیلی سی ہے لیکن دنیا کے طعنوں اور اور دنیا کی باتوں کو اہمیت نہ دیتے ہوئے پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ باہر نکل پڑی ہے۔

اسے دنیا اور دنیا داروں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ بس اپنی زندگی جی رہی ہے۔ اس کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں ہیں۔ وہ اسی حالت میں ننگے پاؤں لے کر اپنے سفر پر روانہ ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں میں جوتے نہ ہونے کے سبب اس کے پاؤں میں کانٹے چبھ جاتے ہیں وہ پتھریلی زمین سے گزرتی ہے تو اس کے پاؤں کے تلوے بری طرح سے زخمی ہوجاتے ہیں۔ اس کے پاؤں کے ناخن ٹوٹنے لگتے ہیں۔ دو پہر کے وقت جب سورج عروج پر ہوتا ہے اور جون کے مہینے میں شدید گرمی بھی ہوتی ہے اس شدید گرمی میں اس کے پاؤں سفر جاری رکھتے ہیں۔ وہ اپنا سفر جاری رکھتی ہے کیوں کہ اس کی نگرانی میں کی بھیڑ بکریاں ہیں۔

گویا یہ سب چیزیں اس کے ساتھ فطری طور پر منسلک ہیں۔ اس کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہے۔ ہر دکھ اور پریشانی سے آزاد بس اپنی زندگی جی رہی ہے۔ اسے کسی قسم کی کوئی بھی پریشانی لاحق نہیں ہے۔ وہ دھوپ سے گھبراتی ہے اور نہ ہی اسے بھوک کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تمام قدرتی چیزوں سے لطف اندوز ہورہی ہے۔ اسے حال کی فکر ہے نہ مستقبل کا کوئی خوف۔ اس کے ساتھ نگرانی کے لیے کتا بھی موجود ہے جس نے جس کا نام اس نے موتی رکھا ہے۔ وہ کتا دن بھر اس کی لڑکی کے ساتھ رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سارے کا سارا ریوڑ اس لڑکی کی سلطنت ہے۔ جس کی وہ بلا شرکت غیرے حکمران اور مالک ہے تمام چیزوں پر حکومت کرتی ہے۔ وہ لڑکی

اس نظم میں بہت زیادہ خوش ہے کیوں کہ وہ کسی کی غلام نہیں ہے۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی تمام کی تمام زندگی آزادی سے عبارت ہے۔ یہاں آزادی سے مراد دور جدید کی آزادی نہیں جس میں محض جسم آزاد ہیں بقیہ تمام تر چیزیں غلام در غلام ہیں۔

انسان نے اپنی زندگی بہت زیادہ مشکل بنا دی ہے ۔ اس کی زندگی میں مشینوں کی طلب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ یہ حقیقی زندگی کے معانی و مفاہیم سے پوری طرح سے نا آشنا ہو چکا ہے۔ اسے طرح طرح کی پریشانیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ پریشانی سے جان چھڑانا اس کے لیے تقریبا ناممکن ہو چکا ہے۔ سید قاسم سیلانی کی نظم در اصل موجودہ دور کے خلاف بغاوت کی ایک آواز ہے۔ جس میں ایک انسان کو کھل کر جینے کی تبلیغ کی گئی ہے۔ یعنی ایک انسان کو ہر حال میں فطرت سے جڑے رہنا چاہیے۔ مصنوعی چیزیں کبھی فطری چیزوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتیں۔ جیسے اس راعی لڑکی کو کسی کے طعنوں اور وقتی زخموں کی کوئی پروا نہیں۔ اسی طرح ایک انسان کو فطرت سے جڑ کر باقی تمام چیزوں بالخصوص مصنوعی چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت ہے تا کہ انسان کی زندگی میں سکون آئے اور وہ اچھی زندگی بسر کر سکے۔

راعیا نیت جہاں پر راعیانہ طرز زندگی کی حمایت کرتی ہے وہیں پر یہ ایک آزاد طرز زندگی کی حمایت بھی کرتی ہے۔ ایک ایسی زندگی جس میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کا ڈر نہ ہو۔ ایک ایسی دنیا جس میں وہ انسان سکھ چین اور سہولت کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکے۔ آزاد کشمیر کے اردو شعرا نے بھی اسی زندگی کی حمایت کی ہے ۔شعرا کی صدا نام نہاد اصولوں کے خلاف آواز بلند ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ایسا اس لیے بھی ہے کہ شعرا کسی بھی معاشرے کے غماز کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ علاقے اور لوگوں کے لیے بے لوث جذبات رکھتے ہیں ۔ان کا علامتی رنگ ان کی شاعری کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ معاشرتی گھٹن اور بالخصوص طرح طرح کی تہذیبی و ثقافتی بندشوں کے باعث ایک عام انسان کی زندگی اجیرن ہوئی تو شعرا نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی ۔ڈاکٹر کاشف رفیق کی نظم مجھے تنہا ہی رہنے دو اس بات کی تائید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے نظم ذیل میں درج کی جاتی ہے:

مجھے تنہا ہی رہنے دو

مجھے تنہا ہی رہنے دو

میں اب تنہائی میں آسودہ رہتا ہوں

مجھے اب محفلوں کے شور سے وحشت سی ہوتی ہے

مجھے اب اپنی خالی جھونپڑی کی خامشی میں چین پڑتا ہے

یہاں کوئی بھی میری اور میرے دل کی باتوں میں خلل پیدا نہیں کرتا

یہاں میں جذب کی حالت میں گھنٹوں کھویا رہتا ہوں

مگر کوئی مرا اٹھتا نہیں کرتا

میں اس ماحول میں اپنی رضا سے جیتا مرتا ہوں

یہاں جو کام بھی کرنا ہو میں جی بھر کے کرتا ہوں

کبھی تا دیر ہنستا ہوں

کبھی تا دیر روتا ہوں

یہاں میری ہنسی سے یا مری آنکھوں کے نم سے کوئی افسانہ نہیں بنتا

یہاں میں حاسدوں کی بد نظر اور دشمنوں کے مکر سے محفوظ رہتا ہوں

یہاں اغیار کے دُشنام اور احباب کے طعنوں کا

مجھ کو ڈر نہیں ہوتا

سو میرے دوستو تم سے گزارش ہے

مجھے تنہائی میں آباد رہنے دو

اگر تم محفل آرائی سے خوش ہو خوش رہو ۔ ۔ ۔ لیکن!

مجھے بھی شادرہنے دو

مجھے تنہا ہی رہنے دو[۲۷]

ایک انسان ایک وقت تک ہی کسی بات کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس کی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب وہ حد پار ہو جائے تو وہ انسان احتجاج پر اتر آتا ہے اور مزاحمت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مصنوعی دور کے انسان کی محفلوں سے الفت،مروت اور محبت وغیرہ کھو چکی ہیں۔ ان کی جگہ پر دکھاوا ریاکاری اور ڈھونگ رچے جا رہے ہیں۔ ایسے میں ایک انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان تمام محفلوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی زندگی آسانی اور آزادی سے بسر کر لے۔ شاعر نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ان کے نزدیک اب انھیں ایسی محفلوں میں نہیں جانا چاہیے بل کہ اب انھیں تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ تنہا جی سکتے ہیں انھیں مصنوعی محبتوں اور الفتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تنہائی میں بھی آسودگی محسوس کرنے لگے ہیں۔ وہ اپنی کٹیا میں تنہا چین اور سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں محفلوں کی زندگی سے نفرت سی ہونے لگی ہے۔ اس لیے وہ تنہائی میں رہنا چاہتے ہیں تاکہ کوئی مشینی مسکراہٹ والا انسان ان کے پاس نہ آ سکے اور ان کا چین محال نہ ہو۔ وہ ایک ایسی آزاد دنیا کی تصویر کشی کرتے ہیں جس میں کوئی بھی شخص ان کا ٹھٹھا مزاح نہیں کرتا۔ ان کے کام کرنے کے طریقے سے کسی کو بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ بس اپنی زندگی اپنی پسند اور آزادی کے ساتھ گزارتے ہیں جہاں وہ ہنسنا چاہیں تو کوئی بھی منع کرنے والا نہیں اور اگر رونا چاہیں تو کوئی بھی ٹوک نہیں سکتا۔ وہ کہتے ہیں میرے رونے اور ہنسنے کی وجہ سے لوگوں میں بلاوجہ کہانیاں نہیں بنتیں کیوں کہ مجھے کوئی دیکھنے والا ہی نہیں۔

انسانی معاشرے میں ایک انسان اگر ہنسنے یا رونے لگے تو لوگوں میں بہت سی چیزیں چہ مہ گوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ جب سے شاعر نے اس دنیا کی محفلوں سے فراغت حاصل کی ہے وہ تمام تر چیزوں سے بچے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے تمام تر دشمنوں کی گالیوں اور نظروں سے بھی محفوظ ہیں۔ اب وہ تمام لوگوں سے گزارش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ کوئی بھی ان کے سکون میں مخل نہ ہو۔ جو

لوگ محفل آرائی کا شوق رکھتے ہیں شوق سے ان کا انعقاد کریں۔ مگر شاعر کو ان تمام چیزوں کے لیے تنگ نہ کیا جائے۔ یہ کیفیت تو انسان کو گویا ورثے میں ملی ہے۔ اسے طرح طرح کی پریشانی اور زد و کوب کا سامنا ہے۔ اسی لیے شعرا کے ہاں اس بات کے خلاف کافی نفرت انگیزی دیکھی جا سکتی ہے۔ یعنی راعیانیت انسانی رویوں کے خلاف بغاوت کا درس دے کر ایک ایسی دنیا بسانے کی بات کرتی ہے جس میں کسی بھی انسان کو کسی دوسرے انسان سے کوئی خطرہ نہ ہو اور وہ انسان فطری انداز میں بے خوفی اور سکون کی زندگی بسر کر سکے۔

انسان کی شدید خواہش ہے کہ وہ ایسے مقامات کی سیر کو نکلے جہاں پر ہر طرف اس تا حد نگاہ کشادہ مناظر دکھائی دیں۔ جہاں پر اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کی مصنوعی منظر کی بجائے کسی فطری نظارے کی دید ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے وہی پرانے مناظر دکھائے جائیں جن میں وہ جیا کرتا تھا۔ جن کے ساتھ اس کا نوس ٹیلجیا جڑا ہوا ہے۔ اسی لیے وہ فرصت کے لمحات نکال کر گھومنا چاہتا ہے۔ جدید مشینی زندگی سے اکتایا ہوا انسان آج کی نام نہاد ابھرتی ہوئی تہذیبوں کا شاکی نظر آتا ہے یہاں پر راعیانیت اور یہ انسان دونوں ایک دوسرے کے معاون و ممدو ہی ہیں۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم میں راعیانیت کے موضوع کو نہایت سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔ جاوید الحسن کی نظم مہاجر پرندے اس ضمن میں ملاحظہ ہو:

مہاجر پرندے

چلو پرواز کرتے ہیں

چلو پرواز کرتے ہیں

اب اُن جھیلوں پر ۔۔

جن پر زندگانی رقص کرتی تھی

جہاں بادل ہوائیں اور لہریں

پیار کرتی تھیں

جہاں ہم نے محبت گنگنائی تھی

جہاں پر زندگانی پہلے پہلے مسکرائی تھی

جہاں پر گیت گائے تھے

وہاں اب برف کا پہرہ ہے۔۔۔

ہر سو دھند اتری ہے

چلو پرواز کرتے ہیں جہاں مہران کی وادی میں جھیلیں

خواب میں ہم کو بلاتی ہیں[۲۸]

اس نظم میں شاعر جاوید الحسن جاوید نے علامتی انداز میں ایک انسان کی خواہش کو پرندے کی خواہش کے روپ میں ظاہر کیا ہے۔ جہاں پر وہ اس خواہش کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہمیں وہاں جانا چاہیے جہاں پر ہم کھل کر آزادی سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہمیں اس طرف جانا چاہیے۔ ہمیں جھیلوں کی طرف پرواز کرنی چاہیے کہ جہاں پر زندگی بانہیں کھولے ہماری منتظر ہے۔ آج کے انسان کا یہ المیہ ہے کہ ہر طرف ہوا میں موجود طرح طرح کا گند اس کی زندگی اور صحت کے لیے خطرہ ہے۔ لیکن اب بھی چند جگہیں ایسی ہیں جہاں پر انسان کو صاف ستھرا ماحول میسر آسکتا ہے۔ جہاں انسان سادگی سے صحت بھری زندگی کا حظ اٹھا سکتا ہے۔

شاعر کہتے ہیں کہ ہمیں ان جھیلوں کی طرف پرواز کرنی چاہیے کہ جن پر زندگی کا رقص ہو رہا ہے۔ جہاں کی ہر چیز دوسری چیز سے پیار کرتی ہے۔ ہوائیں، لہریں اور بادل بھی پیار کی بے مثال داستانیں رکھتے ہیں۔ جہاں سے محبتوں کا آغاز ہوا تھا جہاں پر چلنے والی ہواؤں کی مسحور کن آواز کسی خوش الحان گلوکار کی سی ہے۔ جہاں پر فطرت اپنے جوبن پر ہے۔ جہاں پر برف ہی برف ہے۔ مہران کی وادی ہی وہ وادی ہے جہاں کی جھیل کے خواب ہمیں ہر وقت ستاتے ہیں۔ ہمیں اپنا وقت وہاں گزارنا چاہیے۔ اگرچہ یہ نظم پرندوں سے متعلق ہے مگر اس میں ایک بات واضح ہے کہ اس نظم میں تمام کی تمام باتیں انسان کی فطرت سے دل لگی

اور محبت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں ایک انسان فطرت سے محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ آج کے جدید انسان میں موجود فطرت کی اس قدر پذیرائی اس بات کی غماز ہے کہ انسان کو ایک ایسا معاشرہ چاہیے جس پر کسی کی اجارہ داری نہ ہو اور انسان کھل کر فطرت کے قریب ترین ہو کر اس کے تمام پہلوؤں سے لطف اندوز ہو سکے۔ جہاں اسے ثقافتی، سرحدی، مشینی اور مذہبی بندشوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

انسان کا ان تمام چیزوں کی مخالفت کرنا جو اس نے اپنی آسانی کے لیے تخلیق کی ہیں کافی مشکل امر ہے۔ لیکن جدید دور کا انسان ان تمام چیزوں سے اکتا چکا ہے۔ وہ ایسی زندگی کی تلاش میں ہے جس میں اس کو سکون ہی سکون میسر ہو۔ جب کہ مشین ایسی چیز ہے جو ہر حال میں انسان کے سکون کو تار تار کرتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصے میں تخلیق ہونے والے ادب کا اندازہ لگایا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان مشینوں سے اکتا چکا ہے۔ مشینوں کے خلاف انسان کی تقریر و تحریر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مشینوں نے اس کو سکون دینے کی بجائے اس کی زندگی کا سکون چھین لیا ہے۔ اگرچہ مشینوں کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تا ہم ذیل میں واحد اعجاز میر کی نظم جس میں مشینوں کی مخالفت کی گئی ہے نظم ملاحظہ کریں:

جاتی سردیوں کی آخری روشن راتیں ہیں

چاند اور ستارے اپنی اپنی خودی کی نمائش میں عریانی کو چھونے لگے ہیں

گھروں میں شور پھیلاتے ٹی وی بند ہیں

بجلی سے چلنے والی کوئی بھی مشین زندہ نہیں

انسان پر سکون ہیں

خلاف توقع لوڈ شیڈ نگ نے ماحول خوب صورت کر دیا ہوا ہے

بجلی کے نظام میں آنے والی فنی خرابی صبح تک ٹھیک نہ بھی ہوئی

تو صبح یقینا اپنے وقت پر طلوع ہو گی

کی نعمتیں ایسی ہیں جو مستقل ملنا شروع ہو جائیں

تو زحمت بن جاتی ہیں

انسانوں کی محبت میں مبتلا ہونے کی بناء پر

میں جنونی ہو گیا اور شیطان کے خلاف اعلان جنگ کر بیٹھا

بہت تھوڑے ممالک نے مرا اتحادی بننا قبول کیا

شہروں کے شہر پناہ لیے گھاٹیوں کی طرف بھاگیں گے انسان جنگلوں میں گھسیں گے

ٹیکنالوجی کو سکتہ ہو جائے گا

مشینوں کی برقی روح پرواز کر جائے گی

مشکل آن پڑے گی

پھر سے ایک سادہ زندگی سیکھنی پڑے گی

انسان ہکا بکا رہ جائے گا

بیج زمین سے پھوٹتا ہے[۲۹]

یہ نظم سرا سر رد عمل ہے جس میں مشینوں کے کردار پر سوال اٹھایا گیا ہے۔ وہ تمام چیزیں جو انسان نے انتہائی ترقی کے بعد حاصل کی ہیں ان میں سے بیش تر چیزیں انسان کی بقا کے لیے خطرہ ہیں۔ انسان نے خود ہی اپنی تباہی کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ جہاں یہ دوسری مخلوقات پر ظلم کرتا ہے وہیں اپنے آپ پر بھی ظلم ڈھاتاہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تمام چیزیں جو انسان نے اپنی سہولت کے لیے تخلیق کی ہیں وہ آج اس کا سکون چھین رہی ہیں۔ انسان کو کسی بھی حال میں قرار میسر نہیں ہے کیوں کہ اس کے گرد و پیش میں موجود مشینیں اس کے دکھ کا مداوا نہیں کر سکتیں۔ جدیدترین ایجادات نے انسان کو انسان سے بہت زیادہ دور کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان تنہائی کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انسان ایک وقت میں بہت دور بات کر سکتا ہے لیکن اپنے قریب بیٹھے ہوئے دوستوں سے رابطہ نہیں

کر سکتا۔ ایک ہی کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے اجنبی ہو چکے ہیں۔ یہ سب کا سب کام مشینوں کی وجہ سے ہی ہے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ آج کا انسان مشینوں سے اکتا چکا ہے۔ اس کی یہ اکتاہٹ کسی بڑے بحران کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔

VI غزل میں راعیانیت:

راعیانیت جہاں دیہی اور سادہ طرز زندگی کے رجحان کا نظریہ ہے وہیں پر نام نہاد تہذیب کے نام پر ہونے والے مظالم کے خلاف بھی ایک آواز ہے۔ ایک ایسی آواز ہے جس میں انسانیت اور فطرت کی بقا کی صدا موجود ہوتی ہے۔ راعیانیت میں ایک شاعر ایسی تہذیب کے وجود پر بھی سوال اٹھا سکتا ہے جو انسان اور اس کے فطری ماحول کی دشمن ہو۔ شاعر اپنے ماحول سے جڑا ہونے کی وجہ سے اپنے گرد و پیش پر نظر رکھتا ہے تا کہ معاشرے میں برپا ہونے والے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوا جا سکے۔ اسی طرح اس بات کی باز گشت ہمیں سید قاسم سیلانی کی شاعری میں بھی ملتی ہے جس میں وہ اپنے ماحول اور معاشرے پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

انسانیت کے نام پر انسانیت کا خون
تہذیب رو رہی ہے درندوں کے شہر میں
ہر سمت آگ خون کی بارش ہے آج کل
ظلمت کا دور دورہ ہے اندھوں کے شہر میں[۲۹]

کچھ طاقتیں سماج میں اپنے آپ کو نجات دہندہ قرار دیتے ہوئے سماج کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اسے پوری طرح سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ جب ان سے اس بابت سوال کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد تو محض انسانیت کو بچانا ہے۔ در اصل اس کے پس پشت ان لوگوں کے اپنے مقاصد کار فرما ہوتے ہیں جو فطرت کے لیے کافی نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی چیز جو فطرت کے لیے نقصان دہ ہے وہ چیز لازمی طور پر انسانیت کے خلاف ہو گی کیوں کہ ہر ایک فطری چیز انسان کے ساتھ براہ

راست جڑی ہوئی ہے۔ اسی لیے شاعر اس بات کی مخالفت کرتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں کہ ان کے نزدیک انسانی بستیوں میں محض خون کی تجارت ہو رہی ہے اور انسانی بستیاں باقی تمام مخلوقات کی نسبت زیادہ خطرناک ہو چکی ہیں۔ ان کا کردار کافی خطرناک اور احمقانہ ہے۔ کوئی بھی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ گاؤں کے لوگوں کا خلوص کسی بھی طور پر باقی لوگوں سے کم ہوتا ہے۔ بل کہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ گاؤں زادے باقی تمام لوگوں کی نسبت زیادہ پرخلوص ہوتے ہیں اسی لیے شعرا گاؤں کی تہذیب و ثقافت کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور شہر کی مصروف زندگی سے اکتائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

انسان ایک ایسی زندگی گزارنے کی تگ و دو میں رہتا ہے جس میں پوری طرح سے سکون ہی سکون ہو۔ تا ہم زندگی کی الجھنیں ایسا کرنے سے روکتی ہیں۔ جس سے اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ شاعر جو اس دنیا اور اس کی بندشوں سے خود کو آزاد سمجھتا ہے ان تمام باتوں کے خلاف احتجاج کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس بابت کی شفیق راجا کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

جب سے پہچان موسموں کی ہوئی

خود پہ چادر سی تان لی ہم نے

اب بسیرا ہے اپنے گاؤں میں

خاک شہروں کی چھان لی ہم نے[۳۰]

ان کے نزدیک انسان جب بہت سارے سماجوں اور علاقوں سے شناسائی حاصل کرتا ہے تو وہ ان لوگوں کے رویوں سے تنگ آکر ان سے الگ ہو کر ویرانے کی زندگی گزارنے کو شہری زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ ایک شخص کہ جو زندگی سے پوری طرح سے بدظن ہو چکا ہے دیہی زندگی اس کے لیے جنت سے کم نہیں ہے۔ اس لیے شاعر شہری زندگی پر دیہی زندگی کو شہری زندگی پر ترجیح دے رہے ہیں۔ جوں جوں ایک انسان، انسان کے رویوں سے آشنا ہوتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے وہ محفلیں ترک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیتا ہے۔ یوں وہ انسان حقیقی زندگی کی طرف قدم

بڑھانے لگتا ہے۔ یہی وہ زندگی ہے جو راعیانیت کی پکار ہے۔ جس میں انسان کسی دوسرے پر منحصر ہونے کی بجائے آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ جو شفیق راجا کے تصورات کی دنیا ہے جس میں شہری زندگی کے خلاف نفرت موجود ہے۔

جہاں پر انسان فطری زندگی سے محروم ہوتا جا رہا ہے وہیں پر انسان کو شکست و ریخت کے مناظر کی فراوانی کافی حد تک متاثر کرتی ہے۔ اس شکست و ریخت سے بچنے کے لیے انسان کے پاس کوئی ٹھوس لائحہ عمل بھی موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسان مصنوعی طرز زندگی اپنانے پر مجبور ہے۔ شاعری میں اس کی بازگشت سنی جا سکتی ہے۔ شفیق راجا اس بابت لکھتے ہیں:

اجاڑ ہو گئے گاؤں میں گھر خموشی سے

تو پھیلتا گیا ہر ایک شہر خموشی سے [۳۱]

یہ دور حاضر کا ایک اہم ترین مسئلہ اور قضیہ ہے جس سے انسان کی زندگی کو نجات ملنا ناممکن ہے۔ یعنی آج کے دور میں انسان نے اپنی سہولیات اور ہوس کے آگے سر بسجود ہو کر دور جدید کی ہر ایک شے کے آگے خود کو مجبور کر دیا ہے۔ جس سے فطری حسن پوری طرح سے مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس شعر میں شاعر کی پریشانی صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ جو گاؤں کے وجود کو ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر ہو رہی ہے۔ شاعر کی یہ پریشانی در اصل فطرت کی پریشانی ہے۔ جس میں فطرت ہی کی نفی کی جا رہی ہے کیوں کہ باقی جان دار تو فطرت کے مطابق زندہ ہیں جب کہ یہ انسان فطرت کو بدلنے کی کوشش میں رہتا ہے۔

انسان نے زمین پر اپنا اجارہ کرنے کے لیے زمین کو غیر فطری انداز میں تقسیم کیا۔اس کی یہ تقسیم اس قدر غیر فطری ہے کہ فطرت کے دوسرے عناصر اس کو کسی بھی طور پر نہیں مانتے۔ صرف انسان ہی ایک ایسا فطری عنصر ہے جو اس غیر فطری تقسیم کو کہیں نہ کہیں تسلیم کر لیتا ہے۔ یہ تقسیم کسی بھی صورت میں فطرت کو قبول نہیں۔ شعرا جو فطرت کی آواز بھی ہیں اس غیر فطری عمل کی مخالفت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جسے ڈاکٹر کاشف رفیق اپنے ایک شعر میں یوں بیان کرتے ہیں:

کوئی سرحد نہ ہو ویزے کی ضرورت نہ رہے

کاش دنیا میرے خوابوں سی بنا دی جائے [۳۲]

اس شعر سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی سرحدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ انسان ایسی سرحدوں کو درخور اعتنا نہیں جاننا چاہتا مگر وہ مجبور ہے کہ اس پر اس کے ہم جنس نے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ اس لیے آج کا انسان سرحدی منافرت کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ جو انسان سرحدوں کی مخالفت کرتے ہیں گویا فطرت کی آواز پر لبیک کہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر کاشف رفیق نے بھی فطرت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ وہ اس خواہش کا اظہار کر رہے ہیں کہ دنیا میں موجود تمام حدیں سرحدیں ختم کر دی جائیں اور تمام جگہوں پر موجود غاصبیت کو سرے سے کچل دیا جائے تا کہ زمین پر صرف قدرت کا راج ہو۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی مرضی کے ملک میں نہ رہے بل کہ اپنی مرضی کے مطابق ویسے ہی ڈیرے ڈالے کہ جیسے باقی جاندار کسی بھی قسم کی رکاوٹ کو درخور اعتنا نہ جانتے ہوئے اپنی من پسند جگہ پر ڈیرے ڈالتے ہیں۔

انسان نے جہاں فطرت پر شکست و ریخت کے نشانات ڈالے ہیں وہیں پر اس نے اپنے ہم جنسوں کو بھی نہیں بخشا۔ انسان ہوس اور لالچ میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ اس نے تو انسان کا ہی قتل عام شروع کر لیا ہے۔ نئی ابھرتی ہوئی انسانی تہذیبوں میں معیشت کا قضیہ اس قدر بڑھ گیا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تسلط بنانے اور معیشت کو مضبوط رکھنے کے لیے خوب قتل عام کر رہی ہے۔ موجودہ دور کی سبھی جنگوں کے پیچھے معیشت ہی کارفرما ہے۔ ایسے میں انسانی جان کی قدر و قیمت ختم ہو کر مصنوعی چیزوں کی قدر میں خوب اضافہ ہو رہا ہے۔ کاشف رفیق اس قضیے کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

نئی تہذیب کی دکانوں میں

خون سستا تھا تیل مہنگا تھا [۳۳]

اس بات میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ انسان نے اپنی معیشت کی بڑھوتری کے لیے کئی ممالک کو اجاڑ ڈالا۔ تیل کے ذخائر پر قبضہ جمانے کے لیے لاکھوں انسانوں کی جانوں کو قربان کر دیا۔ ان حالات میں ایک شاعر انسانی بستی اور فطرت کی آواز بن سکتا ہے۔ درج بالا شعر میں شاعر کاشف رفیق نے عمدگی کے ساتھ آج کی اس نئی تہذیب کی کارستانی بیان کر دی ہے۔ جس میں وہ انسانی جانوں کے ضیاع پر دکھ کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ بتا رہے ہیں کہ آج انسانی زندگی کی نسبت مصنوعی چیزیں زیادہ قیمتی ہو گئی ہیں۔ یہی انسان کی نام نہاد بالادستی کی خرابی ہے کہ وہ جس قوم کو چاہتا ہے نیست و نابود کر دیتا ہے۔

آج کا انسان اس بات پر متفق ہے کہ اگر وہ پتھر کے زمانے میں ہوتا تو وہ صحیح معنی میں زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوسکتا تھا۔ آج کے انسان کے مقدر میں آزادی نہیں۔ آج کے انسان کے مقدر میں یہی افراتفری اور نفرت انگیزیاں ہیں جو سرحدوں، مذاہب اور رنگوں کی بنا پر پروان چڑھتی ہیں۔ آج کا انسان فطری زندگی سے کوسوں دور ہے۔ جہاں سے زندگی کے آثار نظر ہی نہیں آتے فطرت کے خلاف ہونے والی سازش کو ناز مظفر آبادی الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

ہم نئی تہذیب کے چکر میں رسوا ہو گئے

فائدے میں ہیں وہی جو اب تلک غاروں میں ہیں [۳۴]

چند قبائل کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ آج بھی پتھر کے زمانے میں ہیں۔ ان کا رہن سہن قدیم طرز زندگی کے مطابق ہے جو فطرت کے بہت زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ان لوگوں کی زندگی کو بہتر قرار دیتے ہوئے جدید انسانی تہذیب کی مخالفت کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک آج کا انسان کافی خسارے میں ہے جب کہ وہ لوگ جو جدت سے دور ہیں وہ کی طرح سے فائدے میں ہیں۔ ان کی زندگیاں بہت زیادہ آسان اور فطرت کے مطابق ہیں جب کہ ہم لوگ تہذیب یافتہ کہلائے جاتے ہیں۔ فطرت کی آواز سے بہت دور کہیں اپنی مصروفیات میں گم ہوتے ہیں جن۔ کے پاس اپنے لیے وقت ہے نہ کسی اور کے لیے۔ بس تمام کی تمام زندگیاں کمائیوں اور اخراجات کو پورا کرنے میں گزر جاتی ہیں۔ قدیم تہذیب کے انسان کے لیے یہ چیزیں کوئی معنی نہیں

رکھتی تھیں۔ اگرچہ آج کا انسان قدیم انسان سے بہت زیادہ محنتی ہے مگر اس کے پاس سکون کے لمحے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ راعیانیت اسی لیے آزاد زندگی کی پیش کش کرتی ہے۔

انسان آزاد طبیعت کا مالک ہے۔ اس لیے اسے اپنی دلی پکار کو سن کر اس پر عمل کرنا چاہیے۔ ضروری ہے کہ انسان سکون کی چند ساعتیں اپنے لیے بھی نکالے اور زندگی کے مصروف ترین اوقات میں سے کچھ وقت اپنی ذات پر بھی خرچ کرے بعض واقعات و حالات انسان کو باہر نکلنے کا موقع فراہم کر دیتے ہیں ناز مظفر آبادی لکھتے ہیں:

کچھ تو تھے حالات بھی صحرا نوردی کا سبب

اور طبیعت ناز اپنی بھی تھی کچھ صحرائی سی[۳۴]

یعنی بعض اوقات وقت اور حالات انسان کو اس نہج پر لے آتے ہیں کہ وہ بے بسی کی حالت میں گھومنے پھرنے لگتا ہے۔ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا ہے۔ یہ صحرا نوردی جہاں اپنے اندر ایک سزا ہے تو وہیں اس میں انسان کے لیے بہت زیادہ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے یادگار ترین لمحات وہی ہوتے ہیں جن میں وہ دنیا مافیا کی قید و بند سے آزاد کہیں کسی صحرا یا جنگل میں گھوم رہا ہوتا ہے۔ جہاں اسے نہ آج کی فکر ہوتی ہے نہ مستقبل کا غم۔ بس ایک زندگی ہوتی ہے جسے وہ فطرت کے سنگ گزارتا ہے۔

ایک دیہاتی انسان کے لیے کسی شہر میں جا کر وہاں کسی پتے پر کسی مکان کو ڈھونڈنا کافی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ دیہاتوں کے لوگ دور دور مکان بناتے ہیں۔ جن کو ڈھونڈنا اور راستہ معلوم کرنا آسان ہوتا ہے مگر اس صورت حال اس کے بر خلاف شہری زندگی میں ایک ہیجانی کیفیت ہوتی ہے ناز مظفر آبادی لکھتے ہیں:

ترے ہی شہر میں تیرا پتہ نہیں ملتا

اگرچہ ذہن میں نقشہ ترے مکان کا ہے [۳۵]

یعنی وہ ذہن میں ایک نقشے کو شہر میں لیے پھر رہے ہیں جس کی مدد سے وہاں پہنچنا تو چاہتے ہیں لیکن یہ ناممکن ہے۔ یہاں پر شاعر ناز مظفر آبادی شہری زندگی پر طنز کر رہے ہیں اور کہتے ہیں لوگوں نے ایک جیسے مکانات تعمیر کروا رکھے ہیں کہ جن کے پتے پر پہنچنا لگ بھگ ناممکن ہے ۔ مجھے تمھارے گھر کا راستہ بھی نہیں مل رہا۔

انسان جتنی مرضی ترقی کر لے اسے ہمیشہ زمین زاد ہی رہنا ہے۔ اس کا زمین کے ساتھ ایک اٹوٹ تعلق ہے۔ جس کو کوئی بھی کسی بھی طور پر نہیں توڑ سکتا۔ کیوں کہ انسان کے خمیر میں فطرت کی آواز موجود ہے۔ جو اسے خود سے الگ نہیں ہونے دیتی۔ وہ لوگ جو ترقی حاصل کر لیتے ہیں اس بات سے دور ہو کر ایسے لوگ اپنی اصلیت کو بھول کر اس دھرتی سے دوری اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو الگ کر لیتے ہیں یا معاشرے سے تعلق ختم کر لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو اس معاشرے سے با لاتر سمجھتے ہیں ناز مظفر آبادی لکھتے ہیں:

زمیں سے رابطہ رکھنے کی خاطر

نہ کی اونچی بہت پرواز ہم نے[۳۶]

ایک شخص جب عروج حاصل کر لیتا ہے تو اس کا نظریہ مختلف ہو جاتا ہے۔ ناز مظفر آبادی کے نزدیک انسان جتنی بھی ترقی کر لے اسے دھرتی کے فطری میلان سے استفادہ کرنا ہے۔ اس کے لیے اس دھرتی کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ جو سہارا دے سکے۔ راعیانیت انسان کو دھرتی کے ساتھ جڑے رہنے کا درس دیتی ہے۔ انسان کو آزادی سے گھومنے کا کہتی ہے اس کو ہر طرح کی فکر سے آزاد رہنے کا بھی درس دیتی ہے۔ ہر طرح کی الجھن سے آزادی ہی انسان کو فطرت سے قریب کر سکتی ہے۔ اس کی یہی آزاد خیالی اس کو صحیح معنوں میں لطف اٹھانے میں مدد دے سکتی ہے۔

زادِ سفر ، سفر کے سوا اور کچھ نہ تھا

ہاں راستوں کی دھول رتوں کے عذاب تھے[۳۷]

یعنی زاد سفر رکھنا بھی اپنے سفر کو دشوار بنانے کے مترادف ہے۔ زادِ سفر ضروری ہے مگر اس سے اس سفر کا لطف کم ہوجاتا ہے۔ ایسا سفر کبھی یاد گار نہیں ہوتا کہ جس میں انسان کو محنت اور مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ایسا سفر ہمیشہ یاد گار اور اچھا ہوتا ہے جس میں انسان کو طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ زاد سفر کے ساتھ سفر کرنا بھی فطرت کے اصولوں کے خلاف ہے اسی لیے شاعر نے زاد سفر کی مخالفت کی ہے۔

بہت سے لوگوں پر جب یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ دنیاوی عیش و عشرت اور اس سے جڑی ہوئی تمام چیزیں جو جدید انسانی تقاضوں میں سے ہیں غیر ضروری ہیں تو انسان تمام چیزوں سے اکتانے لگتا ہے اور وہ مصنوعی زندگی سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے ناز مظفر آبادی لکھتے ہیں:

پھرتے ہیں آج وہ بھی گریبان و سر کھلے

کل تک تھے جن کے واسطے شاہوں کے در کھلے

ہم کر چکے تھے راہ جنوں پہلے اختیار

خلق خدا پہ بعد میں اس کے ثمر کھلے[۳۸]

یعنی جب انسان پر آزادی اور بالخصوص حقیقی آزادی آشکار ہونے لگتی ہے تو پھر وہ ہر طرح کی عیش و عشرت اور آرام دہ چیزوں کو خیر آباد کہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ فطرت میں راحت اور سکون تلاش کر لیتا ہے۔ یعنی جلد یا بدیر لیکن یہ بات ہر ایک پر عیاں ہوجاتی ہے کہ اصل زندگی تو فطرت کے ساتھ ہے۔ کچھ لوگوں پر یہ بات پہلے آشکار ہو جاتی ہے اور کچھ لوگوں پر یہ بات بعد میں آشکار ہوتی ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انسان نے بہت زیادہ ترقی کی منازل طے کرلی ہیں مگر یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان کو کبھی مشین سے عشق ہوا ہے نہ ہو سکے گا۔ یہ فطری جذبہ صرف فطری چیزوں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ناز مظفر آبادی اس بات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کوئی شک نہیں نئے دور میں گیا آسمان پہ آدمی

مگر آج تک نہیں کر سکا کسی دل کو فتح مشین سے[۳۹]

یعنی انسان نے ترقی ضرور کی ہے اس نے طرح طرح کی ایجادات بھی کر لی ہیں تاہم یہ آج تک ایسی مشین نہیں ایجاد کر پایا جس سے لوگوں کے دل بھی فتح کیے جا سکتے ہوں۔ یہاں یہ طنز ان لوگوں پر ہے جو انسانوں پر مشینوں کو ترجیح دیتے اور مشینوں کو ہی اپنے گھر کا فرد مان لیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وقت مشینوں میں گزارنے کی وجہ سے ان کا انسان سے تعلق ٹوٹتا چلا جا رہا ہے۔آزاد کشمیر کی اردو غزل میں راعیا نیت کے موضوع کو کافی بہتر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں جگہ جگہ شاعر جدت اور جدیدیت کے نام پر ہونے والے مظالم اور ہولناک مناظر کی نفی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حدوں اور سرحدوں کے نقصانات اور مٹتی ہوئی قدیم تہذیب کی باز گشت کشمیری شعرا کی شاعری کا حسن ہے۔ جس میں شاعر بدلتے ہوئے ماحولیاتی تناظر کو نہایت عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جدید زندگی پر طنز کرتے ہوئے احمد عطا اللہ لکھتے ہیں

عطا اس زندگی پر حق ہے بس خانہ بدوشوں کا

ہمیں دنیا کے موجود و میسر مار دیتے ہیں[۴۰]

درج بالا شعر میں احمد عطا اللہ نے جدید دور کے انسان کی زندگی کا تقابل قدیم دور کے انسان کی زندگی سے کیا ہے۔ ایسی زندگی جس میں انسان کو سود و زیاں کی پروا نہ تھی جس میں انسان کے لیے ہر نیا دن ایک نئے پیغام کے ساتھ شروع ہوتا تھا۔ جس میں ایک راعی ہر نئے دن میں کسی نئی جگہ کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ آج کے دور میں بھی اس راعی کی زندگی باقی تمام لوگوں کی نسبت بہت زیادہ مختلف اور منفرد ہے۔ایک راعی کو موجود اور میسر کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اسی پر گزارا کرتا ہے جو اسے میسر ہوتا ہے۔ جب کہ جدید انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اس دور کی ضرورت کے مطابق اپنی زندگی گزارنا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ جس کے باعث ایک انسان کی زندگی سے حقیقی خوشی نکل گئی ہے۔ حقیقی زندگی کی جگہ مصنوعی زندگی اس کے رہن سہن پر غالب آ چکی ہے۔ جب کہ اس زندگی کو بھرپور انداز میں اگر کوئی جی رہا ہے تو وہ خانہ بدوش ہیں

کیوں کہ انھیں کسی بھی چیز کی کوئی فکر اور اندیشہ نہیں۔ ایک اور شعر میں احمد عطا اللہ راعیانیت کے ایک اور پہلو کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

شہر سے ہم چل پڑے پہچان کرنے کے لیے

گاؤں میں اک شکل تھی حیران کرنے کے لیے

ایک سازش ہورہی ہے اس کے آنگن میں عطا

ہنستے بستے گاؤں کو ویران کرنے کے لیے[۴۱]

شہری زندگی میں انسان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ وہ کچھ دیر رک کر کسی چیز کا بغور جائزہ لے سکے۔ شہر میں ہر انسان دوسرے انسان سے نا آشنا ہوتا ہے۔ کئی شناسا چہرے بھی ہوتے ہیں مگر کسی بھی وقت ان میں تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں۔ برسوں کے یارانے پل بھر میں رفع ہو جاتے ہیں۔ ماحولیاتی تنقید ان تمام عوامل کی نشاندہی کرتی ہے جو انسان اور اس کے ماحول کے مابین تعلقات کی نوعیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ احمد عطا اللہ کے نزدیک اس شہر میں ایسی کوئی صورت نہیں ہے جو انھیں حیران کر سکے۔ یہاں پر شاعر خوب صورتی کی بات کرتے ہوئے گاؤں زادوں کو شہر زادوں پر ترجیح دے رہے ہیں۔ دوسرے شہر میں احمد عطااللہ گاؤں کی مٹتی ہوئی تہذیب کے لیے نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔ وہ گاؤں کی تہذیب کے فطرت سے تعلق کی بات کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں شہر کا باسی ہوں پر مجھے گاؤں پسند ہے اور میں گاؤں کی فطری زندگی کے لیے ترس رہا ہوں۔ جدید انسان آج کی ترقی یافتہ مگر تھکا دینے والی زندگی سے اکتایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ گاؤں کی زندگی کو شہری زندگی پر ترجیح دیتے ہوئے احمد عطااللہ ایک اور شعر میں کہتے ہیں

سنو یہ گاؤں نہیں شہر ہے یہاں کس نے

ہمارے سر پہ سے تازہ گلاب وارنے ہیں [۴۲]

یہاں یہ شعر گاؤں کی فطری خوب صورتی کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ جس میں شاعر اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ گاؤں والے تو انسانوں پر گلاب وارنے کا جذبہ رکھتے ہیں ان کی

زندگی محبت اور خلوص کی زندہ مثال ہے۔ ان کے ہاں رکھ رکھاؤ کی تہذیب ہے وہاں پر لوگ دل سے ایک دوسرے لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ شہروں میں تعلقات سود و زیاں کی بنا پر ہوتے۔ شہروں کی تہذیب میں اسی شخص سے محبت کی جاتی ہے جس سے کوئی فائدہ جڑا ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کو کم ہی وقعت دی جاتی ہے جن میں بلا واسطہ یا بالواسطہ کوئی مقصد چھپا ہوا نہ ہو۔ اس شعر میں شاعر نے گاؤں کی زندگی کو شہری زندگی پر فوقیت دی ہے۔گاؤں کی زندگی بلاشبہ شہروں کی مصروف زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ گاؤں کی زندگی اور تہذیب میں قدیم انسانیت کے آثار ملتے ہیں۔ وہاں کا ماحول بھی ایسا ہے کہ جو فطرت کے بہت زیادہ قریب ہے عطااللہ اسی فطرت کو بیان کرتے ہوئے اپنے شعر میں کہتے ہیں:

شہر کی آنکھ میں مہتاب نہیں آ سکتا

گاؤں سے اڑ کے تو تالاب نہیں آ سکتا [۴۳]

گاؤں میں لوگوں نے پانی کے حصول کے لیے تالابوں کو باقی رکھا ہوا ہے۔ شہروں میں تالابوں کی جگہ مصنوعی باولیوں نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ سے شہر والوں کو فطری مناظر دیکھنے کا موقع نہیں مل پاتا اور ایک دیہاتی خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ جیسے چاند کو پانی میں دیکھنے کا منظر بالکل الگ اور منفرد ہے۔ مگر شہروں میں تو یہ سہولت میسر ہی نہیں ہے تو پھر کیسے کوئی شہری ان مناظر سے لطف اٹھا سکتا ہے۔ ان پرلطف مناظر سے حظ اٹھانے کے لیے انسان کو فطرت سے قریب ہونا پڑتا ہے۔ جو شہری انسان کے لیے قریب قریب ناممکن ہوتا جا رہا ہے

بیسویں صدی کے اواخر کے انسان کے ناس ٹیل جیا میں فطری زندگی کی عکاسی بڑی دھوم دھام سے ملتی ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کریں جس میں شاعر احمد عطااللہ گاؤں کی یاد کو شعر میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آخری دوست کی گم کردہ نشانی جیسا

ایک گاؤں تھا کسی یاد پرانی جیسا [۴۴]

اس شعر میں محبت کے لطیف جذبات کو گاؤں کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں ایک شاعر کے جذبات میں آ کر یہ کہ رہا ہے کہ انسان پر ایک ایسا بھی وقت آتا ہے جب وہ قیمتی ترین شے کھو دیتا ہے۔ ایک انسان کے لیے سب سے زیادہ قیمتی چیز اس کے کسی پیارے شخص کی نشانی ہوتی ہے۔ شاعر گاؤں کو اس قیمتی نشانی کی طرح ہی گردانتا ہے۔ گاؤں کی زندگی کا اشعار کے نتیجے میں موجود ہونا اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ شاید ابھی گاؤں کے ماحول سے محبت رکھتا ہے۔ وہ اس وقت میں جینا چاہتا ہے اور مزید وقت گاؤں کے فطری ماحول میں گزارنا چاہتا ہے۔ جو جدید شہری تہذیب کے خلاف ایک بغاوت بھی ہے۔گاؤں کے تالابوں کا ذکر گذشتہ صفحات میں بھی کیا گیا ہے ایک اور شعر میں شاعر احمد عطااللہ گاؤں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے پانیوں کی تعریف یوں کرتے ہیں:

شام سے پہلے وہاں چاند اتر آتا تھا

گاؤں کا پانی نہیں تھا کسی پانی جیسا [۴۵]

گاؤں کے پانی صفائی کے باعث بہت زیادہ شفاف ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر چیز کا عکس اس میں دکھائی دیتا ہے۔ چاند کا عکس بھی برملا طور پر اس پانی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان پانیوں میں چاند کا نظارہ کرنا اپنے آپ میں بھی ایک خوب صورت منظر ہے ایک انسان جو گاؤں کی زندگی جیا ہوا ہو اور اس نے فطرت کو اتنے قریب سے دیکھا ہو صرف وہی شخص اس منظر سے محسوس ہو سکتا ہے کیوں کہ اس منظر میں موجود دل کشی کو محسوس کرنے کے لیے تخیل اور تصور کی طاقت کو بروئے کار لانا پڑتا ہے جو ایک عام قاری اور سامع کے بس کی بات نہیں ہے۔ شاعر نے بہت اچھے انداز میں گاؤں کی شاندار فطری زندگی کی عکاسی کی ہے جس میں فطرت اپنے جوبن پر دکھائی دیتی ہے۔

گاؤں کی فضا اور گاؤں کے بے لوث لوگ ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی یہی بے لوثی لوگوں کو بھاتی ہے ان کی گفت گو اور ان کے عمل سے فطری جذبے اور انسیت کی ایسی جھلک نظر آتی ہے کہ دیکھنے والے باقی تمام تر چیزوں کو بھلا کر بس ان میں ہی کھو جاتے ہیں جس کی عکاسی احمد عطا اللہ کے یہ اشعار کرتے ہیں:

بھیگی باتیں رستہ کاٹنے لگتی ہیں

رکتے رکتے گاؤں میں رہ جاتے ہیں

دل تک کالا کرتی ہے شہروں کی دھوپ

یہیں کہیں اس چھاؤں میں رہ جاتے ہیں[۴۶]

گاؤں والوں کی بے لوث محبتاور سادہ کاری اس قدر فطری ہوتی ہے کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اس میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ان لوگوں میں گزارے دوسرے شعر میں عمر عطا اللہ شہری زندگی کی قباحت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہروں کی زندگی بہت زیادہ غیر فطری ہوتی ہے۔ ایسی زندگی کے جس میں انسان دوسرے انسانوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔دوسرے انسانوں کے لیے دل میں میل بیٹھ جاتا ہے وہ کہتے ہیں ہمیں اس درخت کی چھاؤں میں بیٹھ جانا چاہیے تاکہ ان کے دل شہریوں کی طرح کالے ہونے سے بچ جائیں۔ہم ایک بھرپور فطری زندگی کا لطف لے سکیں اور اس سے حظ اٹھا سکیں۔

شاعر کی آواز دراصل گاؤں کی زندگی کی فطری پکار ہے جس میں ایک انسان شہروں کی زندگی سے اکتایا ہوا معلوم ہوتا ہے جس میں بہت زیادہ مصروف رہے گاؤں کے لوگوں میں بھی کسی شخص کی زندگی بہت اچھی ہوتی ہے جیسے کہ وہ لوگ جو بہت زیادہ مال و متاع نہیں رکھتے اور نہ ہی زمینوں جائیدادوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اس موضوع کو احمد عطا اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

کچے گھر میں ہیں کم زمین ہیں ہم

گاؤں میں سب سے بہترین ہیں [۴۷]

گاؤں میں چند لوگوں کے پاس بے شمار جائیدادیں ہوتی ہیں لیکن ان میں سے چند ایک لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان تمام چیزوں سے دور ہوتے ہیں جن کے پاس بہت کم جایئداد ہوتی ہے ایسے لوگ ذہنی سکون میں ہوتے ہیں کیوں کہ ان کا سکون اس وقت چھن جاتا ہے جب اس کے پاس مال و دولت زیادہ ہو۔وہ اپنی جائیداد میں اضافہ کرنا چاہتا ہو ۔جس کے پاس سر چھپانے کے لیے گھر ہو اور

کھانے کو دو وقت کی روٹی دستیاب ہو ایسے میں اگر کچا گھر بھی نصیب ہو تو وہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہے اسی لیے شاعر اپنے آپ کو گاؤں والوں میں سب سے اچھا مانتے ہیں کیوں کہ ان کے پاس زندگی گزارنے کا ایسا طریقہ موجود ہے جس میں اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

گاؤں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انسان وہاں راستہ نہیں بھولتا جس سے بھی راستہ معلوم کرو وہ سیدھا راستہ بتا دیتا ہے۔ وہ جہاں پر جانا چاہتا ہے آسانی سے پہنچ سکتا ہے اسے کسی قسم کی فکر نہیں کرنا پڑتی گاؤں میں تقریبا ہر ایک شخص دوسرے سے واقف ہوتا ہے۔ مگر شہروں میں رہنے والے لوگ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے نالاں رہتے ہیں۔ جہاں کی زندگی پ مفادات سے بھری ہوئی ہے۔ گاؤں کی زندگی کی جتنی خوبیاں بیان ہوں کم ہیں۔ احمد عطا اللہ ان کا اظہار یوں کرتے ہیں:

گاؤں کے رستے کیسے سیدھے سادے تھے

شہر میں آ کر آیا موڑ کہانی میں

دور نگر سے تھک کر آئے لگتے ہو

پاؤں ڈال کے بیٹھو ٹھنڈے پانی میں [۴۸]

شہری آبادی میں مکانات کی بہتات انسان کو راستے بھلا دیتی ہے کہ انسان جب کہیں سے چل کر دوسری جگہ جاتا ہے تو وہ بہت زیادہ تھک جاتا ہے اس کی تھکن اتارنے کے لیے کھلی فضا ٹھنڈے پانی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے شاعر احمد عطااللہ کہتے دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں ٹھنڈے پانی میں بھگوئیں گاؤں میں ٹھنڈے پانی کے چشمے ہوتے ہیں جب کہ شہروں کے نلکوں میں آنے والا پانی بھی بہت زیادہ گرم ہوتا ہے یہاں بھی اشعار گاؤں کی زندگی کو شہری زندگی پر ترجیح دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ دیہی زندگی میں شہری زندگی والی مصنوعی چیزیں بہت تھوڑی ہیں۔

کم سامانی میں جینا ہر انسان کو آنا چاہیے اس میں بہت ساری جگہوں پر انسان کے لیے بہت فائدے ہیں۔اس کے سبب جینے کے لیے انسان کو بہت زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑتی کیوں کہ سادگی سے فطری انداز میں زندگی گزارنا کافی آسان ہے۔احمد عطااللہ لکھتے ہیں:

شہر کی یادیں شہر میں چھوڑ کے آیا ہوں

جینا سیکھ رہا ہوں کم سامانی میں [۴۹]

شہر میں رہتے ہوئے انسان کو شہری زندگی کے تمام تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں اسے ہر طرح کی پریشانی کو جھیل کر اپنی تمام تر ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے اس شعر میں احمد عطا اللہ کم سامانی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو فطری طرزِ عمل ہے ۔جس میں انسان کو مصیبت نہیں جھیلنا پڑتی وہ آسانی کے ساتھ زندگی کے سفر میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے ۔یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ انسان نے غیر ضروری چیزوں کو اپنے لیے ضروری کر دیا جو انسان کی مجبوری بن چکی ہیں اب انسان تمام چیزوں سے پیچھا چھڑانا بھی چاہے تو ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

زندگی دراصل انھی لوگوں کی ہے جو اس کو کھل کر جیتے ہیں۔ جو لوگ زندگی کو مجبور کر دیتے ہیں وہ کبھی زندگی جی ہی نہیں سکتے زندگی ہمیشہ ایسے لوگوں میں نمودار ہوتی ہے کہ زندگی کے ہاتھوں مجبور نہیں ہوتے بل کہ اس کو ایسے جیتے ہیں کہ جیسے ان کو جینا چاہیے جس کے بارے میں احمد عطااللہ لکھتے ہیں:

انھی میلے کچیلے سے انھی ناکام لوگوں میں

عطا سچی خوشی دیکھی ہے میں نے عام لوگوں میں [۵۰]

یعنی ہم کہ سکتے ہیں کہ وہی لوگ زندگی جینے کا حق ادا کر رہے ہیں کیوں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں مجبور تو نہیں ہوتے۔ جیسے آتی ہے گزار دیتے ہیں ان لوگوں کے پاس زندگی گزارنے کا بہتر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موجود میں بھی بھرپور زندگی بسر کر لیتے ہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر طرح کے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار رکھتے ہیں۔ اسی لیے شاعر کے

نزدیک ان لوگوں کی زندگی ہی اصل زندگی ہے ہماری زندگی تو سود و زیاں کی فکر کی نذر ہو جاتی ہے۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم نے کوئی بھرپور زندگی جی ہے۔ ہم نے صرف اور صرف زندگی کی غیر ضروری چیزیں پوری کی ہیں اصل میں یہی زندگی راعیا نیت کی پکار بھی ہے کہ ایک انسان بھرپور فطری زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔

گاؤں کے لوگ سیدھے سادے اور عیاری سے نابلد ہوتے ہیں اس لیے ہر ایک شخص ان کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔ ان کی تمام باتیں لوگوں پر عیاں ہو جاتی ہیں۔ انھیں کسی قسم کی چالاکی نہیں آتی احمد عطااللہ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گاؤں کے ہم ہیں، اور عطا جی لوگوں پر

کھل جاتے ہیں ہنسنے سے اور رونے سے [۵۱]

گاؤں والوں کا کوئی بھی عمل کسی سے مخفی نہیں ہوتا وہ سب پر عیاں ہو جاتے ہیں شہر والوں کی مسکراہٹ اور آنسو غرض یہ کہ ہر چیز غیر دائمی اور مصنوعی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک دیہی انسان کے جذبات فطری اور دائمی ہوتے ہیں۔ جن سے کوئی بھی منھ نھیں موڑتا۔ ہر ایک شخص پر وہ جذبات عیاں ہو جاتے ہیں ان کی تہذیب میں کسی قسم کا کوئی دکھاوا شامل نہیں ہوتا۔ان کی تہذیب فطرت سے قریب تر ہے اور فطرت کبھی کسی جھوٹی چیز کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ فطرت ہمیشہ سچائیوں کو تسلیم کرتی ہے ۔ایک بچے کے رونے اور ہنسنے سے اس کی کیفیت کا پتہ چل جاتا ہے۔وہ بچہ فطرت کی آواز ہوتا ہے۔ یوں ہی گاؤں والے بھی اپنی اپنے اوپر فطرت کو لازم کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے بھی جذبات سب کے سامنے آجاتے ہیں دراصل یہ بھی راعیانیت ہی ہے۔

انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر سے بہترین کی طرف لے کر جائے۔ اس کی یہی خواہش اس کو نقل مکانی پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ پر ہجرت کر کے جاتے ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرتے ہیں۔ ان کا واحد مقصد یہی ہوتا ہے کہ ان کی زندگی بہتر سے بہترین ہو سکے۔ اپنی زندگی کو بہترین کرنے کی خواہش انسان کو تا عمر سفر میں رکھتی ہے۔

کچھ لوگ اس سلسلے میں گاؤں سے شہروں کی طرف چلے جاتے ہیں جہاں کا ماحول انھیں راس نہیں آتا ان کے تمام خوابوں پر پانی پھر چکا ہوتا ہے کیوں کہ گاؤں کی طرح شہر ہر ایک آنے والے کا دل سے خیر مقدم نہیں کرتا۔ اس لیے وہ اداسی کی حالت میں دوبارہ اپنے گاؤں کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں رضا علی عابدی کا شعر ملاحظہ کیجیے:

سو اب کہ لوٹا تو ساتھ اپنے اداس چہرہ ہی لے کے آیا

یہ گاوں زادہ تو شہر جاتے سمے بہت ہی زیادہ خوش تھا[۵۲]

یہ شعر اپنے آپ میں گاؤں کی برتری کو ظاہر کرتا ہے کیوں کہ شہری لوگ کبھی کسی کا دل سے خیر مقدم نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ بہت سارے لوگ دل برداشتہ ہو کر شہر سے واپس اپنے گاؤں کی طرف چلے جاتے ہیں کیوں کہ گاؤں والوں کا مزاج بہت سادہ فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ جب کہ شہر کے لوگ چالاک ہوتے ہیں جس کی وجہ سے گاؤں والوں کی ان کے ساتھ زیادہ نبھ نہیں سکتی اور وہ واپس ہی چلے جاتے ہیں۔

شاعر رضا علی عابدی کے اس شعر میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک گاؤں زادہ شہری لوگوں کے رویوں سے تنگ آ کر واپس گاؤں کی طرف لوٹ گیا ہے۔ یہاں پر اس شعر میں شاعر رضا علی عابدی نے گاؤں والوں کی سادہ مزاجی کی بات کی ہے جس میں گاؤں کی زندگی کو شہری زندگی سے زیادہ مناسب اور فطرت سے قریب تر بتایا گیا ہے۔ جو راعیانیت کی ذیل میں آتا ہے۔

حوالہ جات

ا۔ فرہنگ تلفظ مرتبہ شان الحق حقی، مقدادر قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۵، ۸۸۶

1- Jos Smith, new nature writing, Bloomsburg, London ۲۰۱۷ ۲۱

۳۔ منور احمد قریشی، دہلیزِ شب، اتفاق پرنٹنگ پریس، مظفر آباد، ۲۰۰۰، ۱۱۲

۴۔ ایضاً، ۱۱۵

۵۔ ایضاً، ۱۲۰۔۱۲

۶۔ جاوید الحسن جاوید، ابھی نظمیں ادھوری ہیں، رومیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۷، ۱۱۲۔ ۱۱۳

۷۔ ایضاً ۱۱۴۔ ۱۱۵

۸۔ ایضاً ۱۶۹۔ ۱۷۰

9. Jos Smith, new nature writing, Bloomsburg, London 2017 21

۱۰ افتخار مغل، بیاض قلمی، مملوکہ، خاور نذیر، مظفر آباد

11. Jos Smith, new nature writing, Bloomsburg, London 2017 21

۱۲۔ مخلص وجدانی، صلیبوں کا شہر، ادبیات، مظفر آباد، ۲۰۰۶، ۷۰

۱۳۔ صابر آفاقی، شہر تمنا، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۰، ۱۲۱ تا ۱۴۵

۱۴۔ منور احمد قریشی، دہلیزِ شب، اتفاق پرنٹنگ پریس، مظفر آباد، ۲۰۰۰، ۹۱۔۹۰

۱۵۔ اسرار احمد مغل، بیاض قلمی، مملوکہ، خاور نذیر، مظفر آباد

۱۶۔ شفیق راجا، لفظ کا کاجل، طلوع ادب، باغ، ۲۰۱۸، ۴۳

۱۷۔ ایضاً ۶۹

۱۸۔ایضاً۱۴۹

۲۰۔صابر آفاقی،سارے جہاں کا درد،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۰،۵۱

۲۱۔ مخلص وجدانی،صلیبوں کا شہر،ادبیات پبلشرز،مظفر آباد۱۹۹۵،۲۱

22.The Ecology of Pastoralism, edited by P. Nick Kardulias, University Press of Colorado, p5

23.The Ecology of Pastoralism, edited by P. Nick Kardulias, University Press of Colorado, p2

24.Lawrence Buell, The Future of Environmental Criticism, Blackwell Publishing, USA, Lawrence, 135

۲۵۔سید قاسم سیلانی، سفر سرائے اور سیلانی، کشمیر کلچرل اکیڈمی، مظفر آباد، ۲۰۱۰، ۱۳۵۔۱۳۶

۲۶کاشف رفیق،اُداس رات کا چاند،خزینہ علم ادب لاہور۲۰۱۴، ۵۳۔۵۴

۲۷۔جاوید الحسن جاوید، ابھی نظمیں ادھوری ہیں، رومیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی،۲۰۱۷، ۲۰۔۲۱

۲۸۔واحد اعجاز میر،ا واگون، نواب سنز پبلی کیشنز، راوال پنڈی،۲۰۱۵، ۴۲

۲۹۔سید قاسم سیلانی، سفر سرائے اور سیلانی، کشمیر کلچرل اکیڈمی، مظفر آباد، ۲۰۱۰، ص ۷۰

۳۰شفیق راجا،لفظ کا کاجل، طلوع ادب،باغ،۲۰۱۸، ۱۰۷

۳۱۔ایضاًص ۱۱۷

۳۲۔کاشف رفیق،اُداس رات کا چاند،خزینہ علم ادب لاہور،۲۰۱۴، ۷۲

۳۳۔ناز مظفر آبادی ، سرگوشی، مثال .پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۸، ۲۵

۳۴۔ایضا ۱۰۴

۳۵۔ناز مظفرآبادی، ہم سخن،مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵، ۴۲

۳۶۔ایضاً ۶۰

۳۷۔ایضاً، ۷۷

۳۸ایضاً، ۱۲۱

۳۹۔ایضاً،۱۴۱

۴۰۔احمد عطا اللہ، ہمیشہ، العصر پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ۱۰۰

۴۱۔ایضاً، ۳۹۔۴۰

۴۲۔ایضاً، ۴۱

۴۳۔ایضاً،۴۳

۴۴۔ایضاً،۴۵

۴۵۔ایضاً،۴۵

۴۶۔ایضاً،۵۵

۴۷۔ایضاً،۵۷

۴۸۔ایضاً،۶۳

۴۹۔ایضاً،۶۴

۵۰۔ایضاً،۳۱

۵۱۔ایضاً،۱۱۲

۵۲۔رضاعلی عابدی،بیاض قلمی،مملوکہ، خاور نذیر،مظفر آباد

باب چہارم

I ماحصل:

گزشتہ چند صدیوں کے دوران میں انسان نے ترقی کے نام پر بہت سے قابل مذمت کام سر انجام دیے ہیں۔ ایسے کام جو انسانیت سمیت کرہ ارضی پر بسنے والی ہر مخلوق کی بقا کے لیے خطرات پیدا کر رہے ہیں۔ انسان ہیں کہ ان نظریات کو آگے بڑھاتے ہوئے جا رہے ہیں جن سے انسان کی مصنوعی ترقی ہوئی ہے۔ انسان کی تمام تر ترقی اور تنزلی تو اس کی زندگی اور بقا سے جڑی ہوئی ہے۔انسان ہو گا تو ترقی ہو گی ورنہ ایسی ترقی کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ جو وجودِ نسانی اور دیگر مخلوقات کے وجود سے متصادم ہو۔ لہذا اب ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ تمام ترقی و تنزلی زندگی اور زمین دونوں کی بقا سے وابستہ ہے۔ ایسا ہر عمل جو زمین اور فطرت کے خلاف ہو اسے تنزلی قرار دیا جائے اور ایسا عمل جو فطرت اور زمین کے لیے موزوں ہو اسے ترقی کے نام سے جانا جائے۔ ماحول ہی ہر جان دار کی پہلی اور آخری آرام گاہ ہے۔ جہاں وہ زندگی سے حظ اٹھا سکتا ہے۔

ماحول کی حفاظت کے معاملے پر پہلے بھی بہت سی باتیں ہو چکی تھیں۔سب سے پہلے ولیم روئیکروٹ نے ماحولیاتی تنقید کی اصطلاح کی استعمال کی۔ جس کے مطابق ماحولیاتی بحران سے نمٹنے اور اس کی نشاندہی بھی ایک ماحولیاتی ادیب کی ذمہ داری ٹھہری۔ ماحولیاتی تنقید بقیہ دبستانوں سے جدا اپنا موقف رکھتی ہے۔ جس میں انسان کی بجائے ارض کو مرکز بنایا گیا ہے۔ارض کا مرکز بننے کا تصور اس سے بھی زیادہ جاندار ہے کیوں کہ ہر زندہ چیز کے لیے جو لازمی عناصر درکار ہیں وہ اسی زمین پر ملیں گے۔

شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام نظریات جو بشر مرکزیت کے حامل ہیں وہ سب کے سب باطل اور حقیقت سے متصادم ہیں۔ ان تمام نظریات کی خلاف ورزی اور ان کے خلاف احتجاج ضروری ہے جو حقیقت سے باہم متصادم ہوں۔ اس لیے ماحولیاتی تنقید ان تمام باطل نظریات کو رد کرتے ہوئے تنقیدی دبستان کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید ہر ایک ماحولیاتی عنصر کی برابری کا درس دیتے ہوئے ہر ایک ماحولیاتی عنصر کی بقا کی بات کرتی ہے۔ ہر اس نظریے کی مخالفت کرتی ہے

جو کسی بھی ماحولیاتی عنصر کے وجود اور بقا کے خلاف ہو۔ فطرت اور فطری عمل سے مزین یہ زمین ہر ایک ذی روح چیز کا محور و مرکز ہے۔ اس لیے ماحولیاتی تنقید کی ہر نشانی حیات مرکزیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ماحولیاتی تنقید کی طرف اس وقت انسان کا دھیان گیا جب صنعتی ترقی کے نام پر ہر طرف فطرت کی اکھاڑ پچھاڑ شروع ہوئی۔ ہر طرف سے ماحول کو بگاڑنے کی کوشش کی۔ موجودہ ماحولیاتی بحران ہی ماحولیاتی تنقید کا سر خیل ہے۔ اگر یہ ماحولیاتی بحران وقوع پذیر نہ ہوتے تو ماحولیاتی تنقید کسی بھی صورت میں ابھرنے نہ پاتی۔ ماحولیاتی تنقید نے انسان کی موجودہ حرکات کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام تر فطری عوامل کی اہمیت اور ناگزیریت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انسان کی فطرت سے یہ لا تعلقی اور اس لا تعلقی کے نتیجے میں برتی جانے والی بے اعتنائی کو ماحولیاتی تنقید نے کافی آڑے ہاتھوں لیا اور انسان پر یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ اس سرزمین پر موجود ہر چیز برابری کی سطح پر زمین کی حق دار ہے۔

ہر ایک ماحولیاتی عنصر کی اپنی مخصوص اہمیت ہے۔ جس سے کوئی بھی شخص یا فرد انکار نہیں کر سکتا۔ انسان کو اب ہر چیز کو برابری کا درجہ دینا ہوگا۔ کسی ماحولیاتی عنصر کو کم سمجھنا انسان کی آپ کی عاقبت نا اندیشی تصور کی جانی چاہیے۔ انسان کی اسی عاقبت نا اندیشی کے باعث ماحولیاتی تنقید جیسے دبستان کو میدان میں آنا پڑا۔ انسان نے باقی جانداروں اور ان کی ضروریات کو پس پشت ڈال کر محض انسان کی فلاح کے لیے کام کیے ہیں۔ قریب سے مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے نہ صرف غیر انسانوں بل کہ انسانوں کے حقوق بھی سلب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انسان نے ہر ایک مظلوم قوم کو دبانے کی کوشش کی۔ اس کے وسائل پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ جہاں برابری کی بات آئی تو اس نے خود کو جنگوں میں دھکیل دیا۔ انسان کا یہ کردار تاریخ میں ظلمت کی انتہا کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ انسان کی پھیلائی ہوئی انھی منفی چیزوں کی درستی اور ماحول کی حفاظت کے لیے ماحولیاتی تنقید کو اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہے تا کہ ماحول کو انسانی مظالم کی نذر ہونے سے بچایا جا سکے۔ فطرت کی حفاظت اور اس وقت ممکن ہے جب انسان ہر ایک فطری عنصر کو برابری کا درجہ عطا کرے گا۔

ماحولیاتی تنقید کے مراحل کو ہم دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے دور میں فطرت کی پیش کش پر زور دیا گیا اور اس دور میں فطرت کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ وہ فطرت لگے۔ ایسی فطرت جو انسانی تہذیب و ثقافت کے آگے ماند یا پھیکی نہ پڑے بل کہ اس کی پیش کش اس انداز میں کی جائے کہ انسانی تہذیب و ثقافت اس کی پیش کش کے آگے مانند پڑ جائے۔ اس دور میں انسان کی طرف سے فطرت پر ڈھائے جانے والے مظالم کی نشان دہی کی گئی تا کہ انسان کی طرف سے فطرت کے ساتھ کیے جانے والے نا روا سلوک کی مذمت کی جائے اور انسان ایسے عمل پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے آئندہ اس سے باز رہے۔ اس دور میں انسانی تہذیب و ثقافت کی نام نہاد پیش کش کے مقابلے میں فطرت کی پیش کش کو خوب صورت اور جاذب انداز میں پیش کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کا مقصد فطرت کی بالا دستی اور انسانی حرکات کی وجہ سے وقوع پذیر ہونے والے معاملات کو سامنے لانا تھا جو فطرت کے بگاڑ کا باعث تھے۔

دوسرے دور میں اس دبستان نے پہلی تمام خوبیوں کو اپنے اندر سماتے ہوئے کچھ چیزوں کا اضافہ کیا۔فطرت کی پیش کش تو فطرت کے طور پر جاری رہی مگر اب ان تمام نظریات کی مخالفت شروع ہو گئی جن کے مطابق کسی ایک ماحولیاتی عناصر کو کسی دوسرے ماحولیاتی عنصر پر برتری حاصل ہے۔ اس کے برعکس تمام تر جانداروں کو برابری کی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ ہر انسان اور غیر انسان کے درمیان موجود فرق اور امتیاز پر سوالات اٹھائے گئے۔ فطرت اورغیر فطرت کی بھی بات کی گئی۔اس تنقیدی نظریے نے یہ بھی باور کروانے کی کوشش کی کہ فطرت کی بگاڑ کے پیچھے امتیازی سوچ کارفرما ہے۔ جب تک اس امتیازی سوچ کو انسان کے ذہن سے نکال نہیں دیا جائے گا تب تک فطرت کی حفاظت کرنا مشکل ہو جائے گی کیوں کہ انسان جب یہ سوچ کر کام کرے گا کہ ہر چیز اس کی سہولت کاری کے لیے پیدا کی گئی ہے تو وہ خود کو ہر ایک ماحولیاتی عنصر سے بر تر تصور کرے گا جس کے نتیجے میں وہ ہر ایک چیز کی اکھاڑ پچھاڑ میں حق بجانب ہو گا۔ اگر اس پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ جس طرح تم اور تمھارا وجود کچھ حقوق رکھتے ہیں بالکل ایسے ہی تمام چیزیں اور ان کے وجود بھی حقوق رکھتے ہیں۔ لہذا ان کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی تمھاری۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کسی بچے کو

دوسرے لوگوں کے حقوق سمجھانے ہوں۔ انسان کی اس استحصالی سوچ کو ختم کر کے اس جگہ برابری کی سوچ پیدا کرنا اس تنقیدی دبستان کا منشور ٹھہرا۔

بدلتے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اس تنقیدی نقطہ نظر کے حامل لوگوں نے اس کی تفہیم سہل بنانے کے لیے مابعد نو آبادیاتی ماحولیاتی تنقید اور تانیثی ماحولیاتی تنقید کو اپنے دائرہ کار میں جگہ دی۔ تا کہ انسان اس تنقیدی نظریے کو بھی اپنائے۔ دوسرے دور میں ماحولیاتی تنقیدی نظریے میں کافی وسعت آنا شروع ہو گئی کیوں کہ انسان کافی حد تک اس بات کو تسلیم کر چکا تھا کہ اس کے وجود کے باعث زمین نہیں ہے بل کہ اس کا وجود زمین کے باعث ہے۔ اس زمین کے علاوہ کوئی بھی ایسا خطہ نہیں ہے جس پر انسان انھی سہولیات کے ساتھ رہ سکے۔ اب انسان کو بھی ایک ماحولیاتی عنصر کے روپ میں دیکھا جانے لگا۔ اس کی وجہ سے انسان کے امتیاز کی باتیں آہستہ آہستہ رفع ہونے لگیں۔ ماحولیاتی انصاف نے جنم لیا جس کو انوائرمنٹل جسٹس کا نام دیا گیا۔ یہ نظریہ انسان کو برابری کی سطح پر جانچنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یعنی ان تمام چیزوں کا جائزہ لیتا ہے جو انسان اور اس سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ نظریہ انسان اور انسان کے آپسی تعلقات پر بھی نظر رکھتا ہے۔ یعنی ہم آسان الفاظ میں یوں کہ سکتے ہیں کہ یہ نظریہ ہر طرح کی حیاتیاتی اکائیوں کے درمیان برابری اور پھر ان تمام اکائیوں کے درمیان موجود آپسی نسلی، علاقائی، صنفی اور طبقاتی تعصب کی مخالفت کرتے ہوئے ہر چیز کو برابری کا درجہ دیتا ہے۔ جس سے انسان پر انسان کی طرف سے ہونے والی زیادتی پر بھی احتجاج کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ نسلی، صنفی یا گروہی نوعیت کی ہو۔ یہ نظریہ ہر طرح کے جاندار کے لیے ایک ہی پیمانہ رکھتا ہے جس سے ہر ماحولیاتی عنصر کو برابری کا درجہ دیا جاتا ہے۔

ادب میں ماحولیات کی پیش کش کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہر ایک ادیب اپنے ادب میں اپنے ماحول کی چھاپ چھوڑ کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب پاروں ماحولیاتی پیش کش کی چھاپ پہلے سے ہی موجود ہے۔ ماحولیاتی تنقید مخصوص نظریات کی پیش کش کی بات کرتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید ہر اس عمل کی مخالفت کرتی ہے جو کسی گروہی، صنفی یا نوعی قسم کے تعصب پر مبنی ہو۔ یہ ادب میں بھی اسی چیز کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید چند نظریات کو پیمانہ بنا کر ادب کو پر رکھتی ہے جس میں بن نگاری کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ بن نگاری کے لیے انگریزی زبان میں Wilderness writing

کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ حیات مرکزیت جو ماحولیاتی تنقید کا بنیادی نظریہ ہے اس کو انگریزی زبان میں Biocentrism کہا جاتا ہے .بشر مرکزیت کا نظریہ جس کو ماحولیاتی تنقید رد کرتی ہے اس کو انگریزی زبان میں کہا Anthropocentrism جاتا ہے .مظاہر پسندی کے لیے انگریزی زبان میں Animismکی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ مقاماتی ادب کے لیے Literature of place کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ راعیانیت Pastoralism جب کہ حیاتیاتی معاشرے کے لیے Bio communityکی اصطلاحات مستعمل ہیں۔ حیاتیاتی مقامیت کے لیے Bio regionalism اور ماحولیاتی تانیثیت کے لیے Eco feminism کی اصطلاحات رائج ہیں۔ مابعد نوآبادیاتی تنقید کے لیے Post colonial Eco criticismکی اصطلاح انگریزی زبان و ادب میں استعمال کی جاتی ہے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ادب اپنے گرد و پیش کی ہی منظر نگاری کرتا ہے۔ اس میں کوئی بھی ایسی غیر ماحولیاتی چیز نہیں ہوتی جو ماحول سے باہر کی ہو یا جس کو انسان نے کبھی دیکھا نہ ہو۔ انسان اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوکر ہی ایک اوب پارہ تخلیق کرتا ہے۔ یہ ادب پارہ در اصل کسی بھی معاشرے کی حقیقی تصویر کشی ہوا کرتا ہے۔ جس میں تمام ماحولیاتی عناصر کے ساتھ ساتھ اس کے علاقے کے لوگوں کی ذہنی سطح اور ان کے خیالات سے بھی آگہی حاصل ہوتی ہے۔ ہر ایک ادب پر مختلف طریقوں سے ماحول سے متاثر ہوتا ہے ہر علاقے کے مخصوص طرز زندگی سے ایک ادب پارہ متاثر ہو سکتا ہے۔ ادب پارے کو متاثر کرنے کے لیے ماحول کی ہر چیز اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ جغرافیائی عوامل بھی ادب پارے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ ہر ایک چیز اپنے ماحول سے متاثر ہوتی ہے۔ اثر انداز ہونے والی ماحولیاتی فطرت ہر ادب پارے میں بھرپور انداز سے دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ادب پارہ درحقیقت اپنے علاقے کی زمینی اور فطری حالت کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے۔ وہ علاقے جو سیلاب کی زد میں ہیں ان میں تحریر ہونے والا ادب بھی سیلابی ریلوں کی پیش کش سے خالی نہیں ہوتا۔ ۲۰۰۵ میں آزاد کشمیر میں ہونے والے زلزلے کے اثرات وہاں کے ادب میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں بے شمار شاعری اور نثر بھی تخلیق کی گئی۔ ہر ایک چیز اس بات پر ہی دلالت کرتی ہے کہ انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے چناں چہ ایک ادیب کا ادب پارہ بھی اسی

زمرے میں آتا ہے۔ ادب پر ماحول کے اثرات سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا کیوں کہ ادب تو اپنے معروض کے عین مطابق ہوتا ہے۔

آزاد کشمیر کا خطہ شاعری کے حوالے سے ایک منفرد مقام ومرتبہ رکھتا ہے۔ اس خطے میں شعر و ادب کی روایت قدیم ہے۔ قدیم ہندوستان میں کشمیر علم و ادب کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ہندو ازم میں اس علاقے کو کافی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ یہ خطہ دور جدید میں اردو زبان و ادب کے مرکز کی حیثیت حاصل کر گیا ہے۔ جہاں پر تخلیق ہونے والا ادب ہر لحاظ سے اپنی انفرادیت اور امتیاز کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ علاقہ کافی ماحولیاتی عوامل سے متاثر ہوا۔ اس کے جنگلات کی کٹائی، دریاوں کے رخ میں تبدیلی اور جغرافیائی تنازعات نے اس کے شہریوں کو کافی متاثر کیا ہے۔ جس کے باعث یہاں کے شاعر اور ادیب برسرپیکار نظر آتے ہیں۔ اس لیے یہاں کی شاعری میں ماحولیاتی عوامل زیادہ سے زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

اگرچہ پاکستان میں بہت تیزی سے ماحولیاتی حالات بدلتے چلے جا رہے ہیں تا ہم اس کے کچھ خطوں کے ماحولیاتی عناصر میں بہت تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ بہت تیزی سے ماحولیاتی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ وہ علاقے جن میں ماحولیاتی تبدیلی کی شرح سب سے زیادہ ہے ان میں کشمیر کا علاقہ سرفہرست ہے۔ یہ علاقہ اپنی خوب صورتی اور کشش و پر فضا مقامات کی وجہ سے دنیا بھر کی نظروں میں رہتا ہے۔ تا ہم گزرتے لمحات کے ساتھ ساتھ اس کا فطری ماحول بھی بری طرح سے متاثر ہورہا ہے۔ ماحولیاتی تبدیلیوں کی چھاپ آزاد کشمیر کے اردو ادب پر دیکھی جا سکتی ہے۔ جس کو ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں دیکھنا زیادہ مناسب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر کی اردو شاعری کو ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں پرکھنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم اور غزل ہر دو اصناف سخن میں بطریق احسن ماحولیاتی پیش کش کی گئی ہے۔

بن نگاری ماحولیاتی تنقید کا ایک اہم نقطہ نظر ہے۔ جس میں ان تمام علاقوں کی بابت بات کی جاتی ہے جو انسان کی خردبرد سے دور آج بھی اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں۔ بن نگاری میں نہ صرف کسی علاقے کی پیش کش کی جاتی ہے بل کہ ہر اس ماحولیاتی عنصر کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے

جس پر انسانی تہذیب و ثقافت کے اثرات نہ پڑے ہوں۔ بل کہ وہ ماحولیاتی عنصر مکمل فطری زندگی گزار رہا ہو۔ اگر وہ کوئی علاقہ ہے تو انسانی تسلط سے مکمل باہر ہو جس پر چاہتے نہ چاہتے انسان اپنا تسلط نہ جما پایا ہو۔

بن نگاری در اصل انسانی تہذیب و ثقافت کے رد عمل کا نام بھی ہے۔ بن نگاری میں ان تمام موجودات کی بابت بات کی جاتی ہے جو انسانی تہذیب کے چنگل سے مکمل طور پر محفوظ ہوں۔ اس ادب نے ان تمام جانوروں کی بابت بات کی جاتی ہے جو سدھائے نہ ہو بل کہ آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہے ہوں۔ اگر سدھائے ہوئے جانوروں کی پیش کش کی جائے تو اس صورت میں کی جائے کہ اس کے خلاف احتجاج ہو تا کہ ہر جاندار کے حقوق کے تحفظ کی بات کی جائے۔ یہ سب عوامل بن نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔

ماحولیاتی تنقید کا براہ راست تعلق ہمارے ماحول اور ماحولیاتی عناصر سے ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر اس ماحولیاتی عنصر کی بابت بات کی جو ہماری زمین اور ماحول کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ انسان کا ترقی کے نام پر ماحول پر حملہ آور ہونا اور جدید تہذیبی رویوں کا پرچار کرنا جس سے ماحولیاتی بگاڑ پیدا ہو بن نگاری کے برعکس ایک نظریہ ہے۔ جس کے مطابق انسان کو ہی مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ بن نگاری ان تمام نظریات کی مخالفت کر کے فطرت کی محافظ بن کر سامنے آتی ہے۔ جس میں ہر چیز کو اس کی فطری حالت میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی غیر فطری حالت یا مصنوعی حالت کو کسی بھی طور پر منظور نہیں کیا جاتا۔

آزاد کشمیر کی اردو نظم میں بن نگاری کے موضوعات کو بہت خوب صورت اور جاذب نظر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم کو بن نگاری میں مثالوں کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ بن نگاری کا اس طرح سے بیان جس میں انسانی بگاڑ کی شکل بالکل نہ ہو بن نگاری کی ذیل میں آتا ہے۔ شعرائے کشمیر نے اپنی اردو نظم میں بن نگاری کو بہت احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ شاعری ایسی ہے جو بن نگاری کی اصطلاح کے وجود میں آنے سے پہلے بھی کی گئی ہے لیکن اس انداز میں اس کی پیش کش اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ شعرائے کشمیر اپنے ماحول کی حفاظت کی خاطر

یہ سب پہلے سے کر رہے ہیں۔ اپنے ماحول کے بچاؤ کے لیے ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آزاد کشمیر کی نظم میں ماحولیاتی تنقید نظریہ بن نگاری کا اس انداز میں بیان ہونا آزاد کشمیر کے شعرا کی فطرت کے لیے جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ نظم میں نگاری کی پیش کش پس منظر کے طور پر نہیں بل کہ مرکزی نقطہ کے طور پر ماحولیاتی محبت کی عکاسی بھی ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے جاندار اور بے جان موجودات کو ایسے انداز سے اپنی نظموں میں جگہ دی ہے یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر کی اردو نظموں میں بن نگاری بکثرت ملتی ہے اور ایسی ماحولیات کا ذکر ملتا ہے جو انسانیت کے تسلط سے مکمل طور پر آزاد ہیں۔

اس حوالے سے آزاد کشمیر کی غزل بھی کافی مفید ثابت ہوئی ہے جس میں نہایت اعلٰی انداز میں بن نگاری کی گئی ہی۔ اگرچہ یہ بہت دشوار کام ہے تاہم اس کو شعرائے کشمیر میں بطریق احسن سرانجام دیا ہے۔ دو مصرعوں کسی بھی موضوع کو بیان کرنا کافی مشکل کام ہے۔ تاہم آزاد کشمیر کے اردو غزل میں اس نظریے کے حامل اشعار مل جاتے ہیں جن کو ڈھونڈنے میں زیادہ محنت اور مشقت نہیں کرنی پڑتی آزاد کشمیر کی اردو غزل میں بن نگاری کا نظریہ بہترین انداز میں داخل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس کے مطابق کسی بھی ماحولیاتی عنصر یا انسانی اجارہ داری کو ظاہر نہیں کیا گیا بل کہ ماحولیاتی عنصر کو فطری انداز سے پلتے بڑھتے اور پھیلتے دکھایا گیا ہے جس کا انسانی اجارہ داری سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ ہر ایک چیز فطری انداز میں زندگی گزرتی ہوئی ظاہر کی گئی ہے

مختصر یہ کہ آزاد کشمیر کی شاعری میں بن نگاری کے نظریے کو زبردستی نہیں برتا گیا بل کہ یہ نظریہ مکمل محبت اور ایثار کے تحت شاعری میں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں ہر طرح سے ماحولیاتی موجودات کے ساتھ ایک ہمدردانہ رویے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں بن نگاری کو انتہائی فطری انداز میں فطرت کے عین مطابق شامل کیا گیا ہے۔ جس کی نظیر کسی اور علاقے کے شعرا میں اس قدر کثرت سے ملنا نا یاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

حیات مرکزیت ماحولیاتی تنقید کا بنیادی نظریہ ہے۔ جس کے مطابق ہر ایک ماحولیاتی عنصر برابر ہے۔ہر ایک چیز کو برابری کی سطح پر جینے کا حق حاصل ہے۔ کسی بھی چیز کو مرکزیت حاصل نہیں

ہے۔ یہ نظریہ در اصل بشر مرکزیت کا رد عمل سمجھا جاتا ہے کیوں کہ بشیر مرکزیت کا نظریہ تو برس ہا برس سے چلا رہا ہے۔ کئی لوگوں نے اس نظریے پر مذہبی عقائد بھی کھڑے کر لیے ہیں۔ لیکن ماحولیاتی تنقید پوری طرح سے اس نظریے کی مخالفت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید ایسے تمام باطل نظریات کے خلاف نہ صرف احتجاج کر رہی ہے بل کہ اس کی مخالفت میں کافی منطقی انداز فکر اپناتے ہوئے انسان پر یہ باور کروانے کی کوشش کرتی ہے کہ انسان بھی باقی ماحولیاتی عناصر کی طرح ہی ایک ماحولیاتی عنصر ہے۔ جو نہ تو کسی کے لیے بنا ہے اور نہ ہی یہ دنیا اس کے لیے بنی ہے۔ بل کہ یہ ہر ایک چیز فطری عمل کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا انسان کو بھی ایسے ہر باطل نظریے سے دور ہی رہنا چاہیے کہ جس کے مطابق انسان ہی اس سر زمین کا مالک ہے۔ یہ سر زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب کا سب انسان کی وجہ سے ہے۔

ماحولیاتی تنقید میں حیات مرکزیت کا نظریہ اس کی بنیاد ہے جس کے مطابق ماحولیاتی عنصر برابر اہمیت کا حامل ہے۔ انسان یا کسی بھی ماحولیاتی عنصر کو کسی دوسرے ماحولیاتی عنصر کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بل کہ یہ تمام کے تمام فطری عمل کا نتیجہ ہیں۔ حیات مرکزیت زندگی کو اہم مانتے ہوئے سب سے بڑا درجہ زندگی کو دیتی ہے جس کے مطابق زندگی ہی کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ زندگی چوں کہ اس کرہ ارض پر سلامت ہے اور پھل پھول رہی ہے لہٰذا اس نسبت سے زمین کو بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی تمام کے تمام ماحولیاتی عناصر برابر ہیں۔ زمین اور زندگی ایسی چیزیں جو باقی تمام تر ماحولیاتی عوامل اور عناصر سے مقدم ہیں۔ یہ تقدیم کسی اور وجہ سے نہیں بل کہ بقا اور سالمیت کی وجہ سے ہے۔ اگر زمین ہوگی تو اس زمین پر موجود باقی چیزیں بھی محفوظ رہیں گی۔ ورنہ کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ زندگی ہوگی تو ہر چیز کی بقا ہوگی۔ لہٰذا ماحولیاتی تنقید ہر جان دار کی برابری اور زندگی کی مرکزیت کی قائل ہے۔ ماحولیاتی تنقیدی نظریہ حیات مرکزیت میں ہر اس عمل کی مخالفت بھی کی گئی ہے جس میں کسی بھی ماحولیاتی عنصر کو انسانیت کے نام نہاد زعم کی نذر کر دیا گیا۔ وہ فن پارے جو انسانی زعم کی مخالفت میں ہوں یا پھر تمام تر ماحولیاتی عناصر کے درمیان برابری کے تعلقات کو ظاہر کریں حیات مرکزیت کے حامل ہوں گے۔ ایسے اشعار، نظمیں، افسانے، ناول وغیرہ ماحولیاتی تنقید میں حیات مرکزیت کے تناظر میں پرکھے جائیں گے۔

آزاد کشمیر کی اردو نظم میں حیات مرکزیت کے حامل عنوانات کو بہت سرعت اور کثرت سے نبھایا گیا ہے۔ آزاد کشمیر کے لوگ فطرت کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تمام تر ماحولیاتی عناصر کی پیش کش ملتی ہے۔ آزاد کشمیر کی شاعری میں ماحول اور ماحولیاتی عناصر کے ساتھ وابستگی کو دیکھا سکتا ہے۔ جس کے مطابق آزاد کشمیر کے شعرا ماحولیاتی عناصر کو برابری کا درجہ دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ایسی سطح کی برابری جس کے مطابق کوئی بھی انسان کسی دوسرے انسان پر برتری حاصل کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا بل کہ ایک عنصر دوسرے عنصر کے لیے دل میں ہم دردی کے جذبات رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ جینے مرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ہر ایک ماحولیاتی عنصر بشمول انسان دوسرے عناصر کے لیے خطرہ پیدا نہیں کرتا بل کہ تمام کے تمام مساوی دکھائی دیتے ہیں۔ آزاد کشمیر کی نظم میں زندگی ایک ایسے انداز میں آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس میں ارض کو مرکزیت حاصل ہے۔ یعنی زمین کی اجارہ داری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ارض مرکزیت کو تو آزاد کشمیر کے نظم نگار شعرا نے پہلے سے ہی اپنا رکھا ہے۔ حیات مرکزیت میں زمین کو اولین مرکزیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

آزاد کشمیر کے شعرا نے زمین کی تقدیم کو برقرار رکھا ہے جو تمام کے تمام زندگی کو پروان چڑھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا نے اس موضوع کو بکثرت استعمال کیا ہے۔ زندگی کی بابت ہونے والی گفت گو میں ہر لحاظ سے زمین کو مرکزی حیثیت دی جائے کیوں کہ زمین زندگی کا پہلا اور آخری وسیلہ ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی محال ہے۔ آزاد کشمیر کی نظم میں ہر طرح کی اجارہ داری کی مخالفت کی گئی ہے جو انسان کی طرف سے کسی بھی دوسرے ماحولیاتی عنصر پر قائم کر دی گئی ہے۔ آزاد کشمیر کا نظم نگار ان تمام مظالم پر خاموش نہیں رہتا بل کہ اپنا احتجاج محفوظ رکھتا ہے اور احتجاج کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زمین پر بسنے والی ہر ایک اکائی پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا ہر کشمیری کا وتیرہ ہے۔ ایسا ہونا اس لیے بھی فطری امر ہے کہ کشمیری پون صدی سے غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک ماحولیاتی عنصر کی آزادی کے لیے آواز بلند کرتے ہیں اور ہر اس شخص کے ہاتھ کٹنے کی دعا کرتے ہیں جو کسی کی بھی آزادی کو سلب کرے۔

آزاد کشمیر کی اردو غزل میں بھی یہ سب موضوعات بڑی جہاں دیدہ گری سے پیش کیے گئے ہیں۔ انسانوں کے حقوق کی بات ہو یا باقی جان داروں کے حقوق کی بات آزاد کشمیر کے غزل گو شعرا اس میں کسی سے پیچھے دکھائی نہیں دیتے بل کہ خطے میں بگڑتی ہوئی صورتحال کے سبب آزاد کشمیر کی غزل میں زیادہ سے زیادہ موضوعات کو نہایت عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ہر اس ماحولیاتی عنصر کے درد کو اپنا درد بنا کر پیش کیا گیا ہے جو انسانی توسیع پسندانہ عزائم کی وجہ سے متاثر ہوا ہے۔

آزاد کشمیر کی اردو غزل میں ارض مرکزیت کے موضوع کو بھی کافی ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں یہ بات باور کروائی گئی ہے کہ ہر ایک چیز زمین سے بر آمد ہوتی ہے تو انسان جیسی مخلوق بھی اسی زمین کی پیداوار ہے۔ یعنی باقی تمام تر باطل نظریات کی کھل کر مخالفت کی گئی ہے۔ جن کے مطابق انسان کو کسی اور سیارے کی مخلوق بتایا گیا ہے۔ شعرائے کشمیر نے اپنی غزلوں میں کمال مہارت کے ساتھ دریاؤں کے رخ کی تبدیلی پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ درختوں کی کٹائی پر بھی مخصوص شعرا کی طرف سے مخصوص انداز میں تنقید کی گئی ہے جو حیات مرکزیت کی ذیل میں آتی ہے۔

المختصر آزادکشمیر کے شعرا نے نظم اور غزل دونوں میں بن نگاری سمیت حیات مرکزیت کے موضوعات کو نہایت اعلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ان میں سے بے شمار نظمیں اور غزلیات ایسی ہیں جو ماحولیاتی تنقید کے وجود سے بھی پہلے کی ہیں۔ یعنی یہ شعرا اپنے ماحول کے معاملے سے بے خبر نہیں بل کہ ہر حال میں اپنے ماحول کی حفاظت کے لیے آواز بلند کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جو اس بات کا مظہر ہے کہ آنے والے دنوں میں شعرا اس طرف مزید توجہ مبذول کریں گے اور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ اور صحت مند ماحول چھوڑ کر جائیں گے۔

مقاماتی ادب سے مراد ایسا ادب جو کسی مخصوص علاقے کے مقام یا کسی مخصوص جگہ کے بارے میں ہو۔ ایسے ادب میں عام طور پر کسی شہر وغیرہ کے حوالے سے ادبی پیش کش کی جاتی

ہے۔مقاماتی ادب کے لیے یہ چیز بھی ضروری نہیں ہے کہ اس میں صرف اور صرف کسی شہر کا تذکرہ ہو۔ اس نظریے کے مطابق کسی بھی مخصوص مقام کو دکھایا جا سکتا ہے جس میں کوئی بھی ماحولیاتی پیش کش موجود ہوسکتی ہے۔ جیسے کسی پہاڑ کا ذکر کرنا تا کہ اس کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اس کی مقاماتی اہمیت بھی ظاہر ہو۔ اس پیش کش میں ماحولیاتی عناصر کا شامل ہونا بھی ضروری ہے۔

اگر کسی دریا وغیرہ کا ذکر ہے تو اس میں بھی کسی ماحولیاتی پیش کش کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ یعنی کسی مقام کے بارے میں تخلیق کیا جانےوالا ادب جس میں ماحولیاتی پیش کش بھی موجود ہو مقاماتی ادب کہلاتا ہے۔ مقامی اور مقاماتی ادب میں فرق لازمی روا رکھا جانا چاہیے کیوں کہ مقامی ادب میں کسی بھی علاقے کی مقامیت، جغرافیے، اس کی تہذیب و ثقافت، زبان اور تمدن وغیرہ کو اپنا موضوع بنایا جاتا ہے۔ جب کہ مقامی ادب میں کسی مخصوص علاقے کے مخصوص ماحول اور جغرافیہ کی بات کی جاتی ہے۔ اس میں کسی علاقے کی مقامیت کی بات تو کی جاتی ہے مگر تہذیب و ثقافت کو کسی بھی طور پر اس میں شامل نہیں کیا جاتا۔ بل کہ تہذیب و ثقافت کے برعکس وہاں کی فطری زندگی کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے تا کہ قاری کسی علاقے کی فطری زندگی کے بارے میں جان سکے اور زیادہ سے زیادہ حظ اٹھا سکے۔ آزاد کشمیر کے بیش تر مقامات ایسے ہیں کہ جن پر ادب میں کافی زیادہ کام ہو چکا ہے اور بہت سارے مقامات کے بارے میں ادب تخلیق کیا جارہا ہے۔ آزاد کشمیر کے نظم نگار شعرا نے مخصوص مقامات کے بارے میں ادب تخلیق کیا ہے اور اس میں مخصوص علاقوں کی زبان، تہذیب و ثقافت اور تمدن وغیرہ کو موضوع بنانے کی بجائے وہاں کی ماحولیاتی پیش کش کی ہے۔ مظفر آباد اور اس کے گرد و پیش میں پھیلے پہاڑی سلسلوں کے بارے میں بہت سی نظمیں تخلیق کی گئی ہیں جو مقامات کے تذکرہ کے علاوہ وہاں کی ماحولیاتی پیش کش بھی کرتی ہیں۔ نظموں میں ان علاقوں کے مخصوص موسموں اور جغرافیائی تبدیلیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن سے ایک قاری خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر کے نظم نگار شعرا نے گرد و پیش میں پھیلے مختلف مقامات کو نہایت عمدگی کے ساتھ اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ آزاد کشمیر کے مخصوص موسم لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں موجود موسموں کی یہ نیرنگی جب مقامی علاقوں کے ساتھ ملتی ہے تو چار چاند لگ جاتے

ہیں۔ کشمیر کی شاعری میں پہاڑی سلسلوں کے ساتھ ساتھ دریاؤں اور جھیلوں کو بھی مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ جس میں ماحولیاتی پیش کش بھی ظاہر ہوتی ہے جو آزاد کشمیر کے شعرا کا امتیاز ہے۔

آزاد کشمیر کی غزل بھی ان تمام موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو نظم میں بیان کئے گئے ہیں اگرچہ یہ مشقت طلب کام ہے مگر اس پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو غزل میں مخصوص علاقوں کے ناموں کے ساتھ ماحولیاتی عناصر کی پیش کش لازماً کی گئی ہے ۔ آزاد کشمیر کی غزل میں جھیل ڈل کا ذکر بہت کثرت سے ملتا ہے جو آزاد کشمیر سمیت پورے خطے کے لیے منفرد اور نمایاں مقام رکھتی ہے۔ جھیل ڈل کے علاوہ پیر چناسی ایک ایسا مقام ہے جس کو غزل کے شعرا نے بہت زیادہ استعمال کیا ہے۔ یعنی آزاد کشمیر کی غزل میں بھی نظم کی طرح مقاماتی ماحولیات کے بھرپور نمونے ملتے ہیں۔ جن میں مقامات کے ساتھ ساتھ وہاں کی ماحولیاتی پیش کش بھی کی گئی ہے۔

راعیانیت ماحولیاتی تنقید کا ایک اور اہم ترین نکتہ ہے۔ جس کے مطابق قدیم زندگی کو جدید زندگی سے بہتر قرار دیا جاتا ہے۔ گاؤں کی زندگی کو شہری زندگی پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان کی وہ زندگی بہتر ہے جو فطرت سے قریب تر ہے۔ ہر وہ چیز ہر وہ زندگی بد تر ہے جس سے انسانی زندگی فطرت سے دور ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے یہ تنقیدی نظریہ شہری زندگی پر دیہی زندگی کو فوقیت دیتا ہے کیوں کہ دیہی زندگی شہری زندگی کی نسبت زیادہ فطری ماحول سے متاثر ہو رہی ہوتی ہے۔

راعیانیت ایک ایسا طرز عمل ہے جو زندگی کو فطرت سے قریب ترین کر کے رکھتا ہے۔ اس مکتب میں ایسے ادب کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے جس نے ایک انسان آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہا اور اسے کسی بھی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑ رہا ہو۔ اسے ہر طرح کی پابندی سے آزاد رکھا گیا ہو۔ ایک ایسے انسان کی زندگی جو ویزے سے آزاد ہو۔ جو مروجہ نام نہاد انسانی تہذیب کے خلاف بر سر پیکار ہو ایسے شخص کی ادب میں پیش کش راعیانیت کے زمرے میں آتی ہے کیوں کہ یہ فطرت سے قریب تر ہے۔

راعیانیت میں راعیانہ ادب بھی شامل ہوتا ہے۔ راعیانیت لفظ راعی سے نکلا ہے جس کے معنی بھیڑ اور بکری چرانے کے ہیں راعیانہ ادب میں ایک ایسے شخص کی بابت بات کی جاتی ہے جو بکریاں چراتا ہو۔ خانہ بدوش کی سی زندگی گزار رہا ہو۔ اس کی زندگی بھی فطرت کے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے کیوں کہ یہ زندگی فطری زندگی کے بہت زیادہ قریب ہوتی ہے۔ یہ زندگی تصنع یا بناوٹ سے بالکل پاک، خالص اور سادہ ہوتی ہے۔ جس میں ایک انسان اپنی ضروریات کے مطابق اپنا مسکن بدلتا ہے۔ وہ فطرت کو دیکھتا اور جانتا ہے اس کو ہر طرح سے فطرت نوازتی ہے۔ اسے دنیا کے ساتھ مقابلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بقیہ جان داروں کی طرح موسمی ہجرت پر مجبور ہوتا ہے۔ ایسی زندگی کی پیش کش راعیانیت ہے۔

آزاد کشمیر کی اردو نظم میں شعرائے کشمیر نے راعیانیت کے حامل موضوعات کو نہایت عمدگی کے ساتھ برتا ہے۔ نظموں میں جہاں دیہی زندگی کی پیش کش نظر آتی ہے وہیں پر شہری زندگی کے خلاف ایک محاذ بھی نظر آتا ہے۔ اس شاعری میں شعرا کی جانب سے نہایت عمدگی کے ساتھ موضوعات کو برتا گیا ہے۔ یعنی زندگی کے حالات اور اس زندگی کا فطرت سے قربت کا عنصر بھی اس شاعری میں ملتا ہے۔ فطرت سے زندگی کی قربت شاعری کو مزید خوب صورت بنا دیتی ہے۔ نظم میں ایک راعی کی زندگی پر لکھی گئی نظم بھی شامل ہے جو شعرا کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کو بیان کرتی ہے۔ یعنی راعیانہ ادب بھی آزاد کشمیر کی اردو نظم کا ایک اہم ترین موضوع ہے جس کے گرد آزاد کشمیر کی اردو نظم گھومتی ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم میں شعرائے کشمیر نے نہایت سلیقہ مندی کے ساتھ راعیانیت کے موضوعات کو برتا ہے۔ گویا اس کا حق ادا کر دیا۔

آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں نام نہاد انسانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ مشینوں کے وجود اور سرحدوں کی رکاوٹوں کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے جو جدید شاعری کا مقصد بھی ہونا چاہیے۔ آزاد کشمیر کی اردو غزل راعیانیت کے حوالے سے کافی بہتر ثابت ہوئی ہے جس شعرائے کشمیر نے نہایت عمدہ انداز میں اس نظریے کے مطابق شاعری کی ہے۔ غزل کے اشعار میں جا بجا گاؤں کی زندگی کو شہری زندگی پر ترجیح دی گئی ہے۔ جگہ جگہ گاؤں کی زندگی کی خوب صورتی بیان کی گئی ہے۔ گاہے گاہے انسانی تہذیب کے تنگ آکر کسی صحرا یا جنگل کی طرف نکل جانے کے اشارے بھی شعرا کی شاعری

میں ملتے ہیں۔ کئی جگہوں پر ازمنہ قدیم کی بات کرکے قدیم زندگی کو آج کی زندگی کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت خیال کیا گیا ہے۔ مشینوں کے وجود پر بھی جا بجا سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

آزاد کشمیر کے ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے شعرا نے شاعری کی اگرچہ شاعری میں یہ تجربات نئے تھے مگر شعرا نے خوب صورت انداز میں ان موضوعات کو بیان کیا ہے۔ ان موضوعات کو شعرا نے اس قدر خوب صورتی کے ساتھ برتا ہے کہ یہ موضوع قدیم اور کلاسیکی رنگ میں ڈھل گئے ہیں۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے نہایت عمدہ انداز میں اپنی شاعری میں ماحولیاتی پیش کش کی ہے۔ اگرچہ یہ من چاہا اور من پسند موضوع نہیں ہوتا لیکن شعرا نے دل کی بات سن کر اس کو ماحول کے ساتھ جوڑ کر بیان کر دیا ہے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ شعرا کسی بھی ظلم کے خلاف خاموش نہیں رہ سکتے۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ جب زمین جو ہم سب کی ماں ہے اس کے ساتھ زیادتی ہو اور شاعر خاموش رہیں۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے غیرت، حمیت اور جذبے کے ساتھ فطرت پر ہونے والے مظالم کے خلاف چپ سادھنے کی بجائے اس کی مخالفت کی ہے۔ شعرائے کشمیر کی یہ کوشش تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف میں لکھی جائے گی۔ جس نے زمین سے محبت کی گویا اس نے زندگی سے محبت کی جس نے زندگی سے محبت کی اس نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے بچا لیا۔ آزاد کشمیر کے شعرا کی شاعری میں فطری ماحول کی پیش کش لائق تحسین ہے۔

II نتائج

ا۔ ادب اور طبعی ماحول کے تعلق کا ایسا مطالعہ جو بشر مرکزیت کے مقابلے میں حیات مرکزیت کو بنیاد بنا تا ہے ماحولیاتی تنقید کہلاتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید انسان اور بالخصوص انسانی تہذیب و ثقافت اور تعمیر و ترقی کے نام پر ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ کے رد عمل کا نام ہے۔

۲۔ فطرت کو ماحولیاتی تنقید کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ ماحولیاتی تنقید صرف اور صرف فطرت کی پیش کش کو سراہتی ہے۔ فطرت کی پیش کش کو بھی اس صورت میں قبول کرتی ہے کہ جب فطرت پس منظر میں نہ ہو بل کہ خود مرکزی کردار کے طور پر سامنے آ رہی ہو۔

۳۔ ماحولیاتی تنقید ہر اس ادب پارے کو سراہتی ہے جس میں انسانی تہذیب و ثقافت ماحول کے تابع ہو نہ کہ ماحول کو تہذیب و ثقافت کے تابع رکھا گیا ہو۔ ماحولیاتی تنقید ایسی پیش کش کا نام ہے جس میں قدرتی ماحول انسان ساختہ تہذیب و تمدن پر برتر دکھائی دیتا ہے۔

۴۔ ماحولیاتی تنقید کسی بھی صورت میں بشر مرکزیت کو برداشت نہیں کرتی بل کہ یہ ہر ایک ماحولیاتی عنصر کو برابری کا درجہ دیتے ہوئے برابری کی سطح پر دیکھنے کی قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادب پارے کو اس میں جگہ دی جاتی ہے جس میں تمام ماحولیاتی عناصر کو برابری کی سطح پر بھی رکھا گیا ہو۔

۵۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری کے ماحولیاتی تنقیدی جائزہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ شاعری مغربی ماحولیاتی تنقید کے تمام فکری زاویوں کا احاطہ کرتے ہوئے ماحول اور انسان کے رشتے کی تفہیم و تعبیر کرتی ہے۔ ماحولیاتی تنقیدی فکر آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مکمل طور پر ظہور پذیر ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مختلف ماحولیاتی پہلو یعنی بن نگاری، حیات مرکزیت، راعیانیت اور ماحولیاتی ادب کے تناظر میں جائزے سے آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں ایک مکمل ماحولیاتی فلسفہ نظر آتا ہے جس میں ایک بھرپور ماحولیاتی سماج دکھائی دیتا ہے۔

۶۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں بن نگاری کو ایک وقیع موضوع کے طور پر لیا گیا ہے۔ جس میں انسانی تہذیب و ثقافت کی اکھاڑ پچھاڑ سے پاک معاشرے کی تصویر دکھائی دیتی ہے جو شعرائے کشمیر کی فطرت کے لیے محبت کو اجاگر کرتی ہے۔

۷۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں حیات مرکزیت کے موضوع کو بھی بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں انسان کو محض ایک ماحولیاتی عنصر کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ کہیں پر بھی یہ شائبہ نہیں ہوتا کہ انسان کسی دوسری مخلوق سے برتر ہے بل کہ تمام کے تمام ماحولیاتی عنصر ایک دوسرے

کے ساتھ مل کر رہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض جگہوں پر بشر مرکزیت کے خلاف احتجاج بھی ملتا ہے۔

۸۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں راعیانیت کے موضوع کو بھی کافی اہمیت دی گئی ہے جس راعیانہ ادب کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی کو شہری زندگی پر ترجیح دی گئی ہے۔ کئی جگہوں پر مشین اور جدید انسانی تہذیب و ثقافت پر بھی وار کئے گئے ہیں جو راعیا نیت کی ذیل میں آتے ہیں۔

۹۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مقاماتی ماحولیات کو بھی نہایت سلیقے کے ساتھ برتا گیا ہے۔ آزاد کشمیر ایک خوب صورت علاقہ ہے جس کے اس کے مختلف علاقوں کو ان کے ناموں کے ساتھ ماحولیاتی پیش کش سمیت شامل کیا گیا ہے جس میں فطری زندگی ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

III سفارشات:

ا۔ بڑھتے ہوئے ماحولیاتی بحران نے انسان سمیت اس کرہ ارضی پر بسنے والی ہے ہر ایک ماحولیاتی چیز کو بری طرح سے متاثر کیا ہے جس کی وجہ سے زندگی کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام علاقوں میں ماحولیاتی ضرورت کے پیش نظر کانفرنسز منعقد کر کے لوگوں کو فطرت کی طرف راغب ہونے کا درس دیا جائے۔

۲۔ ہمارے ملک کے ماحولیاتی بحران کے پیچھے سب سے بڑا ہاؤسنگ سوسائٹی کا ہے حکومت وقت کو چاہیے کہ وہ ان ہاؤسنگ سوسائٹی پر پابندی عائد کرے تا کہ فطری ماحول کو آگے بڑھایا جا سکے۔

۳۔ بچپن سے ہی بچوں میں فطرت کے لیے محبت پیدا کرنے کے لیے تیسری جماعت سے نصاب میں ماحولیاتی اور فطری عناصر سے متعلق کہانیاں شامل کی جائیں۔

۴۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مظاہر پسندی کے عناصر کے بارے میں بھی تحقیق کی جاسکتی ہے جس کو اس مقالے میں جگہ نہیں دی گئی۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں انوائرمنٹل جسٹس کے ساتھ ساتھ ایکو فیمینزم کے عناصر بھی موجود ہیں جن پر تحقیق ہونا ابھی باقی ہے۔

۵۔ مختلف تنقیدی دبستانوں میں ماحولیاتی تنقید کا اپنا ایک مقام ومرتبہ ہے۔ جو کئی تنقیدی نظریات سے بہت زیادہ مفصل اور مکمل ہے۔ جو ہر طرح کے ماحولیاتی عنصر کے لیے اپنا ایک الگ نقطہ نگاہ رکھتی ہے۔ یہ انسان پر موجود انسان کی بالادستی کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ ہر ایک چیز کے حقوق کی بات کرتی ہے۔ اس لیے اس تنقیدی نظریے کو ہر سطح کے نصاب میں شامل کیا جائے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ (Working Bibliography)

احمد عطااللہ، ہمیشہ، العصر پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱

اعجاز نعمانی، کہے بغیر، رومیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۹

افتخار مغل، انکشاف، اساطیر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳

ایم یامین، دھوپ کا لباس، مطبوعات نقاط، اسلام آباد جون، ۲۰۱۲

زاہد کلیم، آتش کدہ، ادبیات پبلشرز، مظفر آباد، ۱۹۷۵ء

زاہد کلیم محراب فکر، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۲۰۰۶ء

زاہد کلیم، نغمہ تار حیات، ادبیات پبلشرز، مظفر آباد، ۱۹۸۰

سید شہباز گردیزی، نئی حقیقتوں کے عذاب، الحمد پبلی کیشن، لاہور، ۲۰۰۱

شفیق راجا، میں حرف حرف سمیٹوں، طلوع ادب پبلی کیشنز، باغ، ۲۰۰۹

شوزیب کاشر، خمیازہ، رومیل پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۷

صابر آفاقی، شہر تمنا، ادبیات پبلشرز، مظفر آباد ۱۹۹۲ء

صابر آفاقی، خندہ ہائے بے جا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۴ء

صابر آفاقی، سارے جہاں کا درد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

کاشف رفیق، کبھی آباد تھا یہاں ایک شہر، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۶

مخلص وجدانی صلیبوں کا شہر، ادبیات پبلشرز، مظفر آباد، ۱۹۹۵

منور قریشی، دہلیز شب، اعزاز الدین، پلشرز، لاہور ۲۰۱۴ء

ناز مظفر آبادی، حرف آشنا، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۷ء

ناز مظفر آبادی، ہم سخن، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء

واحد اعجاز میر، آواگون، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۵ء

واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، خزیہ علم وادب، لاہور ۲۰۰۴

واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۴

۱۴۔ ثانوی ماخذ(Secondary Sources)

آزر عسکری، کشت زعفران، کشمیر نیشنل بک فاؤنڈیشن، مظفر آباد، جولائی ۱۹۷۶ء

اورنگزیب نیازی، ڈاکٹر (مترجم) ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل، اردو سائنس بورڈ لاہور,۲۰۱۹ء

جمال نصرت، ہمارا ماحول اور ہماری زمہ داری، نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ ۲۰۱۲ء

حق نواز مغل، زرا سی رات ڈھل جائے، میٹرو بکس کمپوزر، راول پنڈی، جنوری ۲۰۰۹

سلیم، اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

شازلی حسن، ڈاکٹر، ماحولیاتی سائنس(ماحولیات کے بنیادی تصورات)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، س۔ن

شنکر لال ،ہم اور ماحول، بچوں کا ادبی ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

لئیق فتح علی, یہ زمین ہماری، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، س ن

لئیق فتح علی، ہمارا ماحول، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۸

محمد خان نشتر، لمحات نشتر، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، نومبر ۲۰۰۲ء

محمد ہاشم قریشی، انسان اور اس کا ماحول، فاوندیشن فار ایجوکشنل ڈویلپ منٹ، نئی دلی، ۱۹۹۳ء

محمد یوسف مڑکی، انسان سائنس اورماحول ،صام آفسیٹ پریس،حیدرآباد، ۱۹۹۳ء

الیاس بابر اعوان، (مترجم) بنیادی تنقیدی تصورات، عکس پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۸ء

انگریزی کتب

Alan Barnard, Jonathan Spencer, Encyclopedia of Socialand Cultural

Anthropology, Routledge, New York,2002

Christopher Braddock, Animism in Art and Performance, Springer International Publishing Ag, Switzerland,2017

Daniel H. Henning, Buddhism and Deep Ecology, The World Buddhist University,2006

David Pepper, Eco-Socialism, Routledge, New York,2003

Eccy de Jonge, Spinoza and Deep Ecology, Routledge, Abingdon,2016

Edward Abbey, Desert Solitaire A Season in the Wilderness, (Electronic Edition) Rosetta Books LLC, New York,2011

Eric Katz, Beneath the Surface: Critical Essays in the Philosophy of Deep Ecology, The MIT Press Cambridge, Massachusetts, London,

Heide Estes, Anglo-Saxon Literary Landscapes, Amsterdam University Press B.V., Amsterdam 2017

Greg Garrard, Ecocriticism the new critical idiom, Routledge Abingdon, 2004

J.A Cuddon, A Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, 5th Edition, Blackwell Publishing, USA, 2013

John Muir, Wilderness essays, Gibbs Smith Layton, Utah,2015

Jonathan Bate, Romantic Ecology, Wordsworth and the Environmental Tradition, Routledge, London,1991

Kaj Arhem, Guido Sprenger, Animism in Southeast Asia, by Routledge 2 Park Square, Milton Park, Abingdon, Oxon, 2016

Lisa Myers, The Wilderness in Medieval English Literature :Genre, Audience and Society, University of New Mexico UNM Digital Repository,2015

Lorraine V. Aragon, Fields of the Lord, University of Hawai'i Press, Honolulu, 2000

Marc Brightman, Vanessa Elisa Grotti, Animism in Rainforest and Tundra, Berghahn Books, New York, 2012

Michael Vincent McGinnis, Bioregionalism, Routledge, New York,2005

Michsel Begon, Ecology from individuals to Ecosystem,4th Edition Blackwell Publishing, USA,2006

Miguel Astor-Aguilera, Graham Harvey, Rethinking Relations and Animism Personhood and Materiality, Routledge, Abingdon, Oxon,2018

Pete R Ree D, Wisdom In The Open Air, University Of Minnesota Press Minneapolis London,1993

Rane Willerslev, Soul Hunters, University of California Press, Berkeley and Los Angeles, California,2007

Terry Hoy, Toward A Naturalistic Political Theory, Praeger Publishers, London,2000

Timothi Clarck, The Cambridge Introduction to Literature and the Environment, Cambridge University Press, New York, 2011

The Ecocriticism Reader: landmarks in literary ecology, edited by Chryll Glotfelty and Harold fromm, the University of Gorgia Press, Athens and London

تحقیقی مقالات

افتخار مغل، آزاد کشمیر میں اردو شاعری، ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۱۹۹۷

فرہاد احمد فگار، آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا، ایم فل، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، ۲۰۱۸

میر یوسف میر، آزاد کشمیر میں حمد و نعت کی روایت، پی ایچ ڈی، ہزارہ یونی ورسٹی، ۲۰۲۱